الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

اگر آپ اسٹیشن پر دیر میں پہنچے ہوں تو
آپ ٹرین سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ
وہ آپ کو لئے بغیر آگے کیوں چلی گئی

شمارہ ۵۷
اگست ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

اگست ۱۹۸۱

شمارہ ۵۷

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق ماہنامہ الرسالہ کی قیمت بڑھا دی گئی ہے۔ ماہ ستمبر ۱۹۸۱ سے اس کی قیمت فی شمارہ تین روپیہ ہوگی۔

•

جو حضرات الرسالہ کی ایجنسی لئے ہوئے ہیں وہ اگر اپنی مطلوبہ تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو براہ کرم فوری طور پر بذریعہ ڈاک مطلع فرمائیں

•

ایجنسی کے تحت پرچوں کا کمیشن آئندہ حسب ذیل ہوگا:

ایک سو پرچوں تک ۲۵ فی صد

ایک سو سے زائد کے لئے ۳۳ فی صد

ایجنسی کے شرائط کی مزید تفصیل آخر میں ایجنسی کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

جب سفر ختم ہوگا

اکسپرس ٹرین لمبا سفر طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ظاہر ہونے والے آثار بتا رہے تھے کہ آخری اسٹیشن قریب آگیا ہے۔ ٹرین کے سیکڑوں مسافروں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا۔ کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کوئی اشتیاق بھری نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، ہر ایک آنے والے پُرمسرت لمحہ کا منتظر تھا جبکہ وہ ٹرین سے اتر کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ اکسپرس ٹرین یارڈ میں کھڑی ہوئی دوسری ٹرین سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ——— خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہوگئیں۔ زندگیاں موت کی آغوش میں سوگئیں، امیدوں کے محل کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔ ایک کہانی جس کا اختتام بظاہر طربیہ (Comedy) پر ہو رہا تھا، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ کر اچانک المیہ (Trugedy) میں تبدیل ہوگیا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آدمی بے شمار کوششوں کے بعد پُراعتماد معاشی زندگی بناتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک بنے ہوئے گھر کی صورت میں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر وہ قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہو جاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

"کوٹھی" کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ "قبر" میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین اختتام پر پہنچ کر حادثہ کا شکار ہو جائے۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دو روپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لئے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لئے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تاکہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منھ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان و شوکت دکھانے کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن و انصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لعنت کیوں

یہود کو اللہ تعالیٰ نے افضل الامم قرار دیا تھا، ان کو تمام دنیا والوں کے اوپر فضیلت عطا کی تھی (بقرہ ۴۷) ان کے لئے دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس کے بعد یہود میں بگاڑ آیا جس کے نتیجہ میں خدا ان سے ناراض ہوا۔ یہاں تک کہ ان پر لعنت کر دی گئی۔ یعنی وہ ہر قسم کے خیر سے دور کر دئے گئے۔ ان کے لئے دنیا میں محکومی لکھ دی گئی اور آخرت میں عذاب۔

یہود کے وہ کون سے جرائم تھے جن کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، ان کا ذکر قرآن میں تفصیل سے موجود ہے۔ یہاں اس سلسلے میں کچھ حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

حق کو پہچان لینے کے باوجود اس کو نہ ماننا	بقرہ ۸۹
خدا کی طرف سے ملی ہوئی سچائی کو چھپانا اور اس کو لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا	بقرہ ۱۵۹
خدا کے حکم کو سیاق و سباق سے ہٹا کر اس کا خود ساختہ مفہوم نکالنا	نساء ۴۶
سچے اہل ایمان کی ضد میں غیر اللہ کے پرستاروں کو اچھا بتانا	نساء ۵۲
کسی مسلمان کو جان بوجھ کر ناحق ہلاک کرنا	نساء ۹۳
خدا کے دین کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرنا	مائدہ ۱۳
اپنے درمیان ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر برائی کرتے دیکھنا مگر اس کو روکنے کی کوشش نہ کرنا	مائدہ ۷۹
ایمان و اسلام کا دعوے دار ہوتے ہوئے نفاق کی روش اختیار کرنا	توبہ ۶۸
اللہ نے جن لوگوں سے جڑنے کا حکم دیا ہے ان سے قطع تعلق کا معاملہ کرنا	رعد ۲۵
باعصمت خواتین پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگانا	نور ۲۳
بے آمیز حق پر قائم ہونے کے سبب سے کسی شخص کو ستانا	مائدہ ۶۰
اختیار پاکر اس کو بگاڑ اور بے انصافی کے لئے استعمال کرنا۔	محمد ۲۲

یہ چند علامتی برائیاں جو یہاں نقل کی گئیں وہ سب کی سب آج مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان میں نہ صرف ان کے چھوٹے گرفتار ہیں بلکہ ان کے بڑے بھی پوری طرح ان میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان یہ سمجھیں کہ وہ خدا کی اُس سنت سے مامون ہیں جس کی پکڑ میں یہود آ گئے تو خدا کی اس محکم دنیا میں اس سے زیادہ نادانی کی بات اور کوئی نہ ہوگی۔ خدا کے یہاں نہ یہود کی خوش خیالیوں کا کوئی اعتبار ہے اور نہ مسلمانوں کی خوش خیالیوں کا، جو بھی برا عمل کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا (نساء ۱۲۳)

بے خوفی کا راز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ ذات الرقاع ہے جو ۴ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں نقل ہوا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں بھی یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ آیا ہے۔

بنو غطفان کا ایک شخص جس کا نام غورث ابن الحارث تھا، اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا میں تمھارے لئے محمد کو قتل کر دوں (الا اقتل لکم محمدا) انھوں نے کہا ضرور، مگر تم کیسے ان کو قتل کروگے۔ غورث نے کہا: میں ان کو غفلت کی حالت میں پکڑوں گا اور قتل کر دوں گا۔ اس کے بعد غورث روانہ ہوا۔ وہ ایک مقام پر پہنچا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اس مقام پر درخت اور جھاڑیاں تھیں لوگ جھاڑیوں کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ رسول اللہ علیہ وسلم بھی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے اور اپنی تلوار آپ نے درخت کی شاخ سے لٹکا دی تھی۔ اتنے میں مذکورہ اعرابی (غورث) آپ کو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے جب دیکھا کہ آپ تنہا لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کی تلوار بھی آپ سے الگ درخت کے اوپر لٹک رہی ہے تو اس نے بڑھ کر آپ کی تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر تلوار کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور کہا: آپ کو کون مجھ سے بچائے گا (یا محمد من یمنعك منی) آپ نے فرمایا اللہ عزوجل۔ اعرابی نے تلوار کو ہلاتے ہوئے کہا: اپنی اس تلوار کی طرف دیکھو جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم کو اس سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں تم سے کیوں ڈروں۔ جب کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے بچائے گا (یمنعنی اللہ منك) آپ کے پُر اعتماد جواب کے بعد اعرابی کو اقدام کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے تلوار میان میں ڈال کر آپ کو واپس کر دی (فشام الاعرابی السیف) اب آپ نے اعرابی کو بٹھایا اور لوگوں کو آواز دی۔ لوگ آئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے پورا قصہ بتایا۔ اعرابی سہما ہوا تھا کہ اب شاید تلوار میری گردن پر چلے گی۔ مگر آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس کو کوئی سزا نہ دی (سیرت ابن ہشام جلد ۳، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

جو لوگ اللہ پر پورا بھروسہ کر لیں ان کو کسی دوسری چیز کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ایک زندہ اور طاقت ور ہستی کی حیثیت سے ہر وقت موجود ہے، ان کو ہر دوسری طاقت کے مقابلہ میں نڈر بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں کسی شخص کی سب سے بڑی طاقت بے خوفی ہے۔ دشمن کو اگر یقین ہو جائے کہ اس کا حریف اس سے نہیں ڈرتا تو وہ خود اس سے ڈرنے لگتا ہے۔

موت کے غار میں بھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعوت کا آغاز کیا تو آپ کی شدید ترین مخالفت کی گئی۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ آپ کو دبانے اور ناکام کرنے کے لئے وہ لوگ جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب انھوں نے کیا۔ مگر آپ کا مشن بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچی۔ وہاں کثرت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی مکہ والے بہت ستاتے تھے۔ آپ نے مکہ کے مسلمانوں سے کہا مدینہ میں اللہ نے تمہارے لئے کچھ بھائی اور مددگار مہیا کر دئے ہیں، تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔ لوگ ایک ایک کر کے جانے لگے۔ قریش کو اس منصوبہ کا علم ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ لوگوں کو جانے سے روکیں۔ کچھ لوگوں کو مارا، کچھ لوگوں کو پکڑ کر گھروں میں بند کر دیا۔ تاہم بیشتر لوگ کسی نہ کسی طرح مکہ سے مدینہ پہنچ گئے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری تھی۔ قریش کو اندازہ ہو گیا کہ تمام مسلمانوں کو مدینہ بھیجنے کے بعد اب پیغمبر اسلام خود بھی مدینہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم کے سوا تمام قبائل قریش کے سردار دار الندوہ (قصی بن کلاب کا مکان) میں جمع ہوئے۔ مشورہ میں مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ بالآخر اس رائے پر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی تلوار لے اور بیک وقت حملہ آور ہو کر محمدؐ کو قتل کر دے۔ اس طرح محمدؐ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ بنو ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور قصاص کے بجائے دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اگلی رات کو تمام سرداروں نے آپ کا مکان گھیر لیا۔ تاکہ صبح کو جب آپ گھر سے باہر نکلیں تو اچانک حملہ کر کے آپ کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام حالات کی خبر تھی اور آپ بھی خاموشی کے ساتھ اپنی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آپ اسی رات کو ابوبکر صدیق رضؓ کے ساتھ مکہ سے نکل گئے۔ آپ مکہ سے چل کر چار میل کے فاصلہ پر جبل ثور کے ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اندازہ تھا کہ قریش کو جب معلوم ہوگا کہ آپ مکہ سے چلے گئے ہیں تو وہ آپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلیں گے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ چند دن غار ثور میں گزاریں اور جب قریش کی تلاش رکے تو مدینہ کا سفر کریں۔

اب قریش کے سوار چاروں طرف آپ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دستہ غار ثور تک بھی پہنچ گیا۔ یہ لوگ تلواریں لئے ہوئے غار ثور کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پاؤں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دکھائی دے رہے تھے۔ یہ انتہائی خطرناک لمحہ تھا۔ ابوبکر صدیق نے کہا: اے خدا کے رسول، دشمن تو یہاں تک پہنچ گیا۔ آپ نے کہا لا تحزن ان اللہ معنا (غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) پھر اطمینان کے ساتھ فرمایا: اے ابوبکر، ان دو کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو (یا ابا بکر ما ظنك باثنين الله ثالثهما)

لطیف تجربات

الاصمعی عبدالملک بن قریب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں دیکھا کہ دو قبریں ہیں، ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ غم کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا ہے۔ میں قریب ہوا تو میں نے سنا کہ وہ ان الفاظ میں دعا کر رہی ہے:

اللهم انك كائن قبل كل شيئ وانك كائن بعد كل شيئ وانك خالق كل شيئ وانك يارب قد خلقت ابوى من قبلي ثم خلقتني بعد هما منهما وانك آنستني بهما ماشئت ثم اوحشتني منهما اذ شئت ۔ اللهم فكن لهما راحما وكن لى بعد هما حافظا

اے اللہ، تو ہی سب سے پہلے ہے اور تو ہی سب سے بعد ہے۔ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اے میرے رب تو ہی نے میرے ماں باپ کو مجھ سے پہلے پیدا کیا، اس کے بعد ان دونوں سے مجھ کو پیدا کیا۔ تو نے ان کے ساتھ مجھے سکون دیا جب تک تو نے چاہا اور پھر جب چاہا تو نے ان کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اے اللہ، تو ان دونوں پر رحم فرما اور ان کے بعد میری حفاظت فرما۔

اصمعی کا بیان ہے کہ اس لڑکی کے حسن کلام نے میری عقل کو مبہوت کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے بیٹی اپنے کلام کو پھر ایک بار دہرا۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولی: اے شیخ، خدا کی قسم میں تمہاری بیوی نہیں کہ تم مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو۔ تم کو اپنے گھر والوں سے بے تکلف ہونا چاہیے۔ اصمعی کہتے ہیں: خدا کی قسم میں یہ سن کر شرما گیا اور وہاں سے بھاگ آیا (نفرت والله عنها حياء منها)

ایک معمولی لڑکی کے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اتنے گہرے انداز میں دعا کرے۔ اس کی وجہ وہ حادثہ تھا جو اس پر گزرا۔ آدمی جب کسی جھٹکے سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں پا لیتا ہے جو اس نے اس سے پہلے نہیں پائی تھیں۔ وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اس سے پہلے کبھی اس کی زبان پر نہیں آئے تھے۔ آدمی طبعی طور پر آسودگی کے حالات کو پسند کرتا ہے۔ مگر آسودگی کسی آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ ان ربانی تجربات سے محروم رہ جائے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے۔

بے کچھ سے سب کچھ تک

جو شخص کم فائدہ پر قناعت کرے گا وہ بڑے فائدہ کا مالک بنے گا ——— یہ ایک ایسا بے خطا اصول ہے جو اپنے اندر ابدی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ جس معاملہ میں بھی اس کو آزمائیں گے یقینی طور پر آپ کامیاب رہیں گے۔

ایک شخص نے بازار میں چھوٹی سی دکان کھولی۔ وہ کپڑا دھونے کا صابن اور کچھ اور چیزیں بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر بہت جلد بھیڑ لگنے لگی۔ دن کے کسی وقت بھی اس کی دکان گاہکوں سے خالی نہ رہتی۔ اس کا راز یہ تھا کہ وہ دو روپے کا صابن پونے دو روپے میں بیچتا تھا۔ آدمی اگر چار صابن خریدے تو عام نرخ کے لحاظ سے اس کا ایک روپیہ بچ جاتا تھا۔ ایک آدمی نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پونے دو روپیہ اس صابن کی تھوک قیمت ہے۔ دکان دار کو وہ صابن کارخانہ سے پونے دو روپے میں ملتا تھا اور اسی دام پر وہ اس کو گاہکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔

اس آدمی نے دکان دار سے پوچھا کہ تم دام کے دام صابن بیچتے ہو۔ پھر تم کو اس میں کیا فائدہ ملتا ہے۔ دکان دار نے کہا کہ میری دکان پر اتنا صابن بکتا ہے کہ اس کی ۲۵ پیٹیاں دن بھر میں خالی ہو جاتی ہیں۔ میں ان خالی پیٹیوں کو ایک روپیہ فی پیٹی کے حساب سے ۲۵ روپیہ میں بیچ دیتا ہوں، اس طرح ہر روز میرے ۲۵ روپے بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب آدمی میرے یہاں سے صابن لیتا ہے تو اکثر وہ کچھ نہ کچھ دوسری چیزیں بھی خرید لیتا ہے، یہ فائدہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ دکان دار دھیرے دھیرے ترقی کرتا رہا۔ اس کا نفع پہلے ۲۵ روپے روز تھا۔ پھر ۵۰ روپے روز ہوا۔ پھر وہ سو روپے اور دو سو روپے روز تک پہنچا۔ آدمی نے پیسہ بچا کر اپنے بغل کی دکان بھی حاصل کر لی اور دونوں کو ملا کر ایک کافی بڑی دکان بنالی۔ اب اس کا کاروبار اور بڑھا۔ یہاں تک کہ دس سال میں وہ شہر کا ایک بڑا دکان دار بن گیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات کس قدر زیادہ ہیں۔ حتیٰ کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی آج "بے نفع" کی تجارت شروع کرے اور کل وہ زبردست نفع والا تاجر بن جائے۔ آج وہ اپنے آپ کو "بے کچھ" پر راضی کر لے اور کل وہی وہ شخص ہو جو "سب کچھ" کا مالک بنا ہوا ہو۔ مگر دنیا کے ان بے حساب امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی لازمی شرط صبر اور عقل مندی ہے۔ جس کے پاس صرف بے صبری اور نادانی کا سرمایہ ہو اس کے لئے دنیا کے بازار میں کچھ نہیں۔

معمولی تدبیر سے

ایک ڈاکٹر نے مطب شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ خصوصیت دکھائی کہ وہ ہر آنے والے مریض کو سلام میں پہل کرتے۔ عام طور پر ڈاکٹر لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مریض ان کو سلام کرے۔ یہاں ڈاکٹر نے خود مریض کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ یہ طریقہ کامیاب رہا اور جلد ہی ان کا مطب خوب چلنے لگا۔ حالانکہ وہ باقاعدہ سند یافتہ نہیں تھے صرف "آر۔ ایم۔ پی" تھے۔

ایک دکان دار نے دیکھا کہ گاہک کے پاس اگر کئی نوٹ ہیں تو عام طور پر وہ میلے اور پھٹے ہوئے نوٹ دکان دار کو دیتا ہے اور اچھے اور صاف نوٹوں کو بچا کر جیب میں رکھتا ہے۔ اس سے دکان دار نے سمجھا کہ گاہک صاف نوٹ کو پسند کرتا ہے۔ اس نے گاہک کی اس نفسیات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ اصول بنایا کہ جب کوئی گاہک اس سے سامان خریدے گا اور قیمت ادا کرنے کے لئے بڑا نوٹ دے گا تو وہ حساب کرتے وقت ہمیشہ گاہک کو نئے اور صاف نوٹ لوٹائے گا۔

دکان دار کے بکس میں ہر طرح کے نوٹ ہوتے۔ مگر جب وہ گاہک کو دینے کے لئے اپنا بکس کھولتا تو پرانے اور پھٹے ہوئے نوٹوں کو الگ کرتا جاتا اور نئے نوٹ چھانٹ کر گاہک کو دیتا۔ نئے نوٹ حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ کیا کہ اپنے تمام پرانے نوٹ جمع کر کے اپنے بینک کو دے دیتا اور اس کے بدلے بینک سے چھوٹے نئے نوٹ حاصل کر لیتا۔ وہ نئے نوٹوں کو اپنے بکس کے پرانے نوٹوں میں ملا دیتا تاکہ گاہک کے سامنے دونوں قسم کے نوٹ ہوں اور وہ دیکھے کہ اس کا دکان دار بکس کے خراب نوٹوں کو الگ کرتا جا رہا ہے اور صاف نوٹوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسے دے رہا ہے۔

دکان دار کی یہ تدبیر بظاہر معمولی اور بے قیمت تھی۔ مگر اس نے گاہکوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ سمجھے کہ ان کا دکان دار ان کا بہت خیال کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے اس معمولی تدبیر سے گاہکوں کے دل جیت لئے۔ اس کی دکان اتنی کامیاب ہوگئی کہ ہر وقت اس کے یہاں بھیڑ لگی رہتی۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کوئی امتیازی خصوصیت پیدا کریں، آپ یہ ثابت کریں کہ آپ لوگوں کے ہمدرد ہیں۔ یہ کام کسی معمولی تدبیر سے بھی ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ محض چند الفاظ بولنے یا پرانے نوٹ کے بدلے نیا نوٹ دینے سے بھی۔

خوش خیالی حقیقت کا بدل نہیں

سڑک پر مجمع ۲۱ نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی اور سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ "اوہ! یہ تو ۱۲ نمبر کی بس ہے"۔ بورڈ دیکھ کر ایک شخص بولا۔ "۱۲ کو ۲۱ کر لو اور چلے جاؤ"۔ دوسرے نے کہا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف مذاق تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ کھڑیا مٹی لے کر بس پر اپنا مطلوبہ نمبر لکھے اور اس پر بیٹھ کر سمجھے کہ اب وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ ہندسہ کا فرق نہیں، حقیقت کا فرق تھا۔ اور حقیقت کے فرق کو ہندسہ کے فرق سے بدلا نہیں جا سکتا ——— یہ بات اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں ہر شخص جانتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ ملت کے رہنما جب ملت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اٹھتے ہیں تو وہاں وہ اس انتہائی معلوم حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندسہ کو بدل کر وہ اُس کام کا کریڈٹ حاصل کر لیں جو اسباب کی اس دنیا میں صرف حقیقت کو بدلنے کے نتیجہ میں کسی کو ملتا ہے۔

ایک ایسا سماج جہاں امتیاز اور لیاقت کی بنیاد پر لوگوں کو درجات ملتے ہیں، ہم مراعات اور تحفظات کے عنوان پر کانفرنس کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں علمی اور اقتصادی طاقت کے بل پر قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں، ہم احتجاج اور مطالبات کے پوسٹر دیواروں پر چپکا رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان و بیان نے بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے، ہم اپنے روایتی کتب خانہ کے بورڈ پر "دورِ جدید" کا لفظ لکھنے کے لئے آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ایسا زمانہ جہاں عالمی ذہن نے سیاست کو سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہم عوام کا ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی آبادی جہاں اختلاف اور شکایت کے گہرے مادی اسباب موجود ہیں، ہم لفظی تقریروں کے کرشمے دکھا کر حالات کو درست کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ہم تعلیم، اقتصادیات، باہمی اتحاد ہر لحاظ سے تمام گروہوں میں سب سے پیچھے ہیں، ہم جلسوں اور کنونشنوں کے ذریعہ ملک کی قسمت بدلنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا جغرافیہ جہاں ہمارے پاس اپنے تحفظ کی بھی طاقت نہیں، ہم "حریف کو نقصان پہنچاؤ" کا طریق کار اختیار کر کے باعزت زندگی حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تمام باتیں اسی طرح بے معنی ہیں جس طرح ۱۲ نمبر کی بس پر ۲۱ نمبر لکھ کر اپنی منزل کی طرف سفر شروع کرنا۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔ کسی چیز کو اگر اس کے فطری طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے ضروری اسباب فراہم کر دئے جائیں تو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہو جاتا ہے جیسے رات پوری ہونے کے بعد سورج کا نکلنا۔ لیکن اگر فطرت کے مقررہ طریقہ سے انحراف کیا جائے اور مطلوبہ چیز کے مطابق ضروری اسباب جمع نہ کئے جائیں تو اس کے بعد ناکامی اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنی پہلی صورت میں کامیابی۔ عالمِ فطرت پر یہ انسان کا حق ہے کہ وہ اس کو کامیاب کرے۔ مگر وہ کامیاب اس کو کرتا ہے جو اس کے مقررہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (Charless Richter) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رشٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رشٹر نے کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہئے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لئے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس ۷ اکتوبر ۸۰)

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ہر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

قانع بنئے

ایک صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز معمولی ملازمت سے کیا تھا اور اب ان کا کافی بڑا کاروبار ہو چکا ہے، انھوں نے ایک ملاقات میں کہا: "جب میں دو سو روپیہ کا ملازم تھا تو میں اپنے کو سو روپیہ کا آدمی سمجھتا تھا، اب جب کہ میرا کاروبار دو کروڑ روپیہ تک پہنچ چکا ہے تب بھی میں اپنے کو صرف ایک کروڑ روپیہ کا آدمی سمجھتا ہوں" ——— یہ وہی چیز ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں قناعت کہا جاتا ہے۔ اس قناعت کا تعلق انفرادی معاملات سے بھی ہے اور اجتماعی معاملات سے بھی۔

یہ بات جو ایک آدمی نے سادہ طور پر کہی، یہی زندگی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اکثر حالات میں آدمی صرف اس لئے ناکام رہتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ اندازہ کر لیتا ہے، وہ اپنی حقیقی استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کر دیتا ہے، وہ "کم" پر قناعت نہ کرتے ہوئے "زیادہ" کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ آدمی اگر مذکورہ تاجر کے اصول پر رہے تو وہ کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

جو آدمی زیادہ خرچ کی استطاعت رکھتے ہوئے کم خرچ کرے وہ کبھی اقتصادی بحران کا شکار نہیں ہوگا۔ جو آدمی دوڑنے کی طاقت رکھتے ہوئے آہستہ چلے اس کے ساتھ کبھی یہ حادثہ پیش نہ آئے گا کہ وہ راستہ میں تھک کر بیٹھ جائے۔ جو اپنے مخالف پر وار کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے صبر کر جائے وہ کبھی اپنے مخالف سے شکست نہیں کھا سکتا۔ جو بڑے کام کے قابل ہوتے ہوئے اپنے آپ کو چھوٹے کام میں لگا دے وہ کبھی اپنی کوششوں کو رائگاں کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ جو سیاسی مقابلہ آرائی کا موقع رکھتے ہوئے غیر سیاسی کام میں اپنے کو مشغول کرے اس کا یہ انجام کبھی نہ ہوگا کہ پُرشور عمل کے بعد بالآخر اس کے حصہ میں جو چیز آئے وہ صرف احتجاج اور فریاد ہو۔ جس کے لئے شہرت کا میدان کھلا ہوا ہو مگر وہ اپنے کو گم نامی کے میدان میں کام کرنے پر راضی کرے۔ وہ کبھی اس حال میں دنیا سے نہیں جا سکتا کہ اس نے اپنے پیچھے اپنا شاندار مقبرہ تو چھوڑا ہو مگر اس کے عمل کے شاندار نتائج کا کہیں پتہ نہ ہو۔

ایک شخص کا قول ہے: دور کے بڑے فائدہ کی خاطر قریب کے چھوٹے فائدہ کو قربان کیا جا سکتا ہے:

Present short interest can be sacrificed for the larger long range gain

اس میں شک نہیں کہ یہ ترقی کا بہت اہم اصول ہے۔ مگر اس اصول کو وہی لوگ برت سکتے ہیں جو دور تک سوچ کر اقدام کرنا جانیں نہ کہ فوری طور پر بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوں۔

معنویت کی تلاش

آرتھر کوئسلر نے البرٹ آئن سٹائن کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا: میں یہ مانتا ہوں کہ سائنسی تحقیق میں سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ اعلیٰ محرک جو چیز ہوتی ہے وہ کائناتی مذہبیت ہے۔ ایک معاصر سائنس داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ ہمارے موجودہ مادی دور میں بھی سنجیدہ علمی تحقیق کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو گہرا مذہبی آدمی ہو (ٹائمس آف انڈیا ۵ اکتوبر ۱۹۸۰)

I maintain that cosmic religiousness is the strongest and most noble driving force of scientific research. A contemporary has said, not unrightly, that the serious research scholar in our generally materialistic age is the only deeply religious human being.

(Einstein as quoted by Koestler in Janus)

مذکورہ قول میں مذہبی ہونے کا مطلب ان دیکھی معنویت پر یقین کرنا ہے۔ سائنس داں جب اپنی تلاش میں نکلتا ہے تو اس وقت جو چیز اس کی رہنما بنتی ہے وہ اس کے اندر یہ چھپا ہوا عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات میں وحدت اور معنویت ہے۔ اگر وہ اس یقین سے خالی ہو تو کبھی وہ اپنی تلاش میں سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔

گویا باعتبار حقیقت ایک سائنس داں اور ایک مذہبی انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایک مذہبی انسان کچھ اعمال کرتا ہے۔ ان اعمال کا مقصد خدا کو خوش کرنا یا آخرت کی دنیا میں اس کا انعام پانا ہے۔ مذہبی انسان خدا کو نہیں دیکھتا اور نہ آخرت کو۔ مگر وہ انتہائی انہماک کے ساتھ اپنے عمل میں مشغول رہتا ہے۔ اس انہماک کی وجہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں پر اس کا کامل عقیدہ ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ سائنسداں کا ہے۔ وہ ساری عمر کسی حقیقت کی جستجو کرتا ہے۔ یہ حقیقت نامعلوم دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ تاہم سائنس داں پیشگی طور پر یہ یقین قائم کر لیتا ہے کہ جو چیز وہ چاہتا ہے وہ کائنات کے اندر چھپی ہوئی موجود ہے، اگرچہ ابھی تک وہ اس کے علم میں نہیں آئی۔

مذہب کی اصل کائنات کی معنویت پر یقین کرنا ہے، ایسی معنویت جو بظاہر ہم کو اپنی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ سائنسی کھوج کی نوعیت بھی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے۔ اس دنیا میں ایک سائنس داں بھی ٹھیک اسی مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں ایک مذہبی انسان ـــــ اس دنیا میں تمام اعلیٰ حقیقتیں چھپی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ اس لئے وہ شخص زیادہ سنجیدگی کے ساتھ کسی اعلیٰ تحقیقی کام میں مصروف ہوگا جو چھپی ہوئی حقیقت پر یقین رکھنے والا ہو۔

حیوان اور انسان کا فرق

حیوان اور انسان جسمانی بناوٹ میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ دونوں کا حیاتیاتی نظام بعض ظاہری فرق کو چھوڑ کر، تقریباً یکساں ہے۔ مگر حیوان کا بچہ حیوان پیدا ہوتا ہے اور بڑا ہو کر بھی حیوان ہی رہتا ہے۔ وہ حیوانیت کے مقام سے آگے نہیں بڑھتا۔ جب کہ انسان کے آغاز و انجام میں بہت فرق ہے۔ وہ ابتدائی پیدائش کے وقت بظاہر حیوان کی سطح پر ہوتا ہے مگر بڑھتے بڑھتے بالکل دوسری مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ حیوانیت کی سطح سے اٹھ کر انسانی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض حیاتیاتی مشابہت کے باوجود حیوان حیوان ہے اور انسان انسان۔

انسانی جنین میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو حیوانی جنین میں نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ سے انسانی جنین بڑھتے بڑھتے بالآخر ایک "دوسری مخلوق" بن جاتا ہے۔ جب کہ حیوانی جنین میں ترقی کی یہ صلاحیت نہیں ہوتی، وہ بڑھنے کے بعد بھی حیوانی مرحلہ ہی میں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے اندر وہ خصوصیات موجود نہیں ہوتیں جو اس کو آگے لے جا سکیں۔ کوئی بھی کوشش حیوانی جنین کو انسان تک ترقی نہیں دے سکتی۔

معلوم ہوا کہ حیوان اور انسان میں ظاہری مشابہت کے باوجود، بہت بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ حیوان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے حیوانی مرتبہ سے آگے بڑھ کر مرحلہ در مرحلہ میکانکی ترقی کرتا ہوا انسان کے مرتبہ تک پہنچ جائے، جیسا کہ ارتقا پسند علماء دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان کے لئے فطری طور پر مقدر ہے کہ وہ ان ترقیاتی مرحلوں سے گزرے اور بالآخر کامل انسانیت کے مقام کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان دو بالکل مختلف نوعیں ہیں۔ ابتدائی ہیولیٰ اگرچہ دونوں کا بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں کو ایک ہی طرح کی دنیا میں رہنا بسنا ہوتا ہے۔ مگر انسان کے اندر خدا نے اپنی روح پھونکی جس کی وجہ سے انسان ایک اور ہی مخلوق بن گیا۔ یہی خدائی روح ہے جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ انسانی جنین حیوان کی منزل سے گزر کر ایک اعلیٰ مخلوق کی صورت اختیار کرلے۔ دونوں ہی کا تعلق خدائی مقدرات سے ہے۔ حیوان کے لئے اول دن سے یہ مقدر رہتا ہے کہ وہ حیوان بنے اور انسان بھی اول دن یہ قدرتی فیصلہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے کہ اس کو بالآخر انسان بن کر کھڑا ہونا ہے۔

موت کے وقت

عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور سفر میں تھا کہ سخت بیمار پڑا اور راستہ میں ہی ۱۵۹ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ فقرہ تھا: بادشاہ وہ ہے جو نہ مرے۔

یزید بن معاویہ کے بعد معاویہ بن یزید بن معاویہ کو خلیفہ بنایا گیا۔ بہت تھوڑی مدت میں ۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا "اپنے خاندان میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دیجئے" اس کے جواب میں انھوں نے کہا "میں نے خلافت سے نہ زندگی میں فائدہ اٹھایا ہے اور نہ مرنے کے بعد اس کا بوجھ اٹھاؤں گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بنو امیہ اس کی شیرینی لیں اور میرے حصہ میں اس کی تلخی آئے۔

مامون الرشید بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ ۲۱۸ھ میں جب وہ مرنے لگا تو آخری جملہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا ——— اے وہ جس کی سلطنت کبھی زائل نہ ہوگی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔ اے وہ جو کبھی نہیں مرے گا، اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔

خلیفہ واثق باللہ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے حکم دیا کہ فرش اٹھا دیا جائے۔ جب فرش ہٹا دیا گیا تو اس نے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا اور کہا: اے وہ جس کی بادشاہی لازوال ہے، اس پر رحم کر جس کی بادشاہی ختم ہوگئی" یہ کہتے ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

خلیفہ معتضد باللہ عباسی کا انتقال ۲۸۹ھ میں ہوا۔ اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے چند عربی شعر پڑھے جن کا مطلب یہ ہے: میں نے بڑے بڑے بہادر مارے، میں نے کوئی دشمن نہ چھوڑا۔ کسی کو بھی میں نے سرکشی پر باقی رہنے نہ دیا۔ میں نے دارالسلطنت کو تمام مخالفوں سے خالی کر دیا۔ ان کو پراگندہ کر کے انھیں مشرق و مغرب میں پھیلا دیا۔ لیکن جب میں اپنی عزت و بلندی میں ستاروں تک پہنچ گیا اور تمام مخلوق کی گردنوں میں میری غلامی کا طوق پڑ گیا تو ایسا ہوا کہ موت نے مجھ پر ایک تیر چلایا اور میری آگ کو بجھا دیا۔ دیکھ لو، اب میں جلد ہی اپنے گڑھے میں ڈالا جانے والا ہوں۔

حجاج بن یوسف نے گورنر بننے کے بعد عراق میں خطبہ دیا: گردنیں اونچی ہو رہی ہیں۔ سروں کی فصل پک چکی ہے اور کٹائی کا وقت آگیا ہے۔ میری نظریں وہ خون دیکھ رہی ہیں جو پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہہ رہا ہے"۔ یزید کے بعد بنو امیہ کی حکومت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لئے اس نے لاکھوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو بے حد سخت تکلیف تھی۔ ابو منذر یعلی نے لوگوں کی طرف سے اس پر لعنت کرتے ہوئے کہا کہ تو اس قوم کا فرعون تھا، آج تیرے لئے نہ نجات ہے اور نہ فریاد۔ حجاج یہ سن کر بری طرح رو پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور کہا: الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ لوگ کہتے کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔ آہ میری ہلاکت، آہ میری ہلاکت، اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا۔

تضاد فکری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے اور نہ تمھاری بیویوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو تمھاری مائیں بنایا اور نہ تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا۔ یہ تمھارے اپنے منھ کی بات ہے۔ اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ دکھاتا ہے۔ منھ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں (احزاب، ابتدائی آیات)

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص نادانی میں اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا (مثلاً انتِ علیّ کظھر امی) تو وہ اس کے لئے حقیقی ماں کی طرح حرام ہو جاتی۔ گویا اس لفظ کے بولنے سے وہ سچ مچ اس کی ماں بن گئی ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو منھ بولا بیٹا (متبنیٰ) بنا لیتا تو وہ اس کو صُلبی بیٹے کی طرح سمجھنے لگتے اور اس پر وہی احکام صادر کرتے جو حقیقی بیٹے کے لئے ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی رواج کے خاتمہ کا اعلان کیا۔

"ایک سینہ میں دو دل" کا مطلب کسی شخص کا بیک وقت دو متضاد نقطۂ نظر رکھنا ہے۔ خدا نے جب انسان کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سوچنے کے انداز میں بھی دوئی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بات خدائی اسکیم کے خلاف ہے کہ کوئی شخص بیک وقت دو مختلف اور متضاد نظریہ کو اپنے اندر جگہ دے۔ ایک طرف وہ حقیقی ماں اور بیٹے کو ماں اور بیٹا سمجھے اور دوسری طرف محض زبان سے کسی کو ماں یا بیٹا کہہ دینے کی بنا پر بھی اس کو ماں یا بیٹا ماننے لگے۔

جو شخص ایسا کرے اس نے گویا فکری دوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ایک طرف ایک حقیقی چیز کو حقیقت سمجھا اور دوسری طرف ایک بے حقیقت چیز کو بھی حقیقت قرار دیا۔ یہ دو متضاد خیالات کو ایک دل میں جگہ دینا ہے جو فطرت کے وحدانی نقشہ کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سچائی اور تعصب کو ایک ساتھ ماننا ہے۔ حقیقت پسندی اور توہم پرستی کو بیک وقت اپنے ذہن میں جگہ دینا ہے۔ ایک رواجی نقطۂ نظر کو بھی اسی طرح تسلیم کرنا ہے جس طرح خالص عقلی نقطۂ نظر کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اسی طرح توحید کے عقیدہ کے ساتھ مشرکانہ خیالات کو ماننا، حقیقت واقعہ اور توہمات کو ایک ساتھ اپنے ذہن میں جگہ دینا، اصولی صداقت کا اقرار کرنے کے ساتھ شخصیت پرستی کو اختیار کرنا، قرآن کی محکم آیتوں پر عقیدہ رکھتے ہوئے پُرعجوبہ قصے کہانیوں میں مشغول ہونا، سب ایک دل والے سینہ کو دو دل والا سینہ بنانا ہے جو سراسر تضاد ہے اور ایسا ہر تضاد خدا کی اس بے تضاد دنیا میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم کو پیاس لگتی ہے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے سچائی کی تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہئے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مرجاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لامحدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لامحدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لامحدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی، محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کر سکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لئے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہو کر اپنے بارے میں ہمیں بتا دے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لئے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنا لے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ آزادی پاکر سرکش بن جائیں ان کے لئے جہنم۔

اور ہم نے ان کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انھیں الگ الگ گروہ بنا دیا۔ اور جب موسیٰ کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا پانی پینے کا مقام معلوم کر لیا۔ اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ۔ اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور کہو ہم کو بخش دے اور دروازہ میں جھکے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ظالموں نے بدل ڈالا دوسرا لفظ اس کے سوا، جو ان سے کہا گیا تھا۔ پھر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس لئے کہ وہ ظلم کرتے تھے　۱۶۲-۱۶۰

مصر کی مشرکانہ فضا سے نکال کر خدا نے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں پہنچایا۔ یہاں ان کی تنظیم قائم کی گئی۔ ان کو بارہ جماعتوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر جماعت کے اوپر ایک نگراں تھا اور حضرت موسیٰ سب کے اوپر نگراں تھے۔

پھر بنی اسرائیل کو خصوصی طور پر تمام ضروریات زندگی عطا کی گئیں۔ پہاڑی چشمے نکال کر ان کے لئے پانی فراہم کیا گیا۔ کھلے صحرا میں سایہ کے لئے ان پر مسلسل بدلیاں بھیجی گئیں۔ ان کی خوراک کے لئے من وسلویٰ اترا جو بآسانی انھیں اپنے خیموں کے سامنے مل جاتا تھا۔ ان کی باقاعدہ سکونت کے لئے ایک پورا شہر اریحا (وادیٔ یردن میں) ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تمھاری تمام ضروریات کا ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ اب حرص اور لذت پرستی میں مبتلا ہو کر ناپاک چیزوں کی طرف نہ دوڑو۔ اس کے بجائے قناعت اور اللہ کے آگے شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرو۔

"باب (دروازہ) میں جھکے ہوئے داخل ہو" یہاں باب سے مراد بستی کا دروازہ نہیں ہے بلکہ ہیکل سلیمانی کا دروازہ ہے۔ زمین میں اقتدار دینے کے بعد بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اپنی عبادت گاہ میں خاشع بن کر جاؤ اور گناہوں سے مغفرت مانگو۔ مسلمانوں کے یہاں جس طرح کعبہ کو بیت اللہ (خدا کا گھر) کہا جاتا ہے اسی طرح یہود کے یہاں ہیکل کو باب اللہ (خدا کا پھاٹک) کہا جاتا ہے۔ یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے عبادت خانہ میں عجز و تواضع کے ساتھ داخل ہو کر اپنے رب کی عبادت کرو اور اللہ کے عظمت و جلال کو یاد کر کے اس کے آگے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے رہو۔ مگر یہود خدا کی نصیحتوں کو بھول گئے۔ وہ خدا کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے خدا کے نام پر خود ساختہ راہوں کی طرف چلنے لگے۔ انھوں نے عجز کے بجائے سرکشی کا طریقہ اپنایا۔ شکر کا کلمہ بولنے کے بجائے وہ بے صبری کے کلمات بولنے لگے۔

یہود جب بگاڑ کی اس حد کو پہنچ گئے تو خدا نے اپنی عنایات ان سے واپس لے لیں۔ رحمت کے بجائے ان کو مختلف قسم کے عذابوں نے گھیر لیا۔

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی۔ جب وہ سبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کرتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ان کی آزمائش ہم نے اس طرح کی، اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے۔ انھوں نے کہا، تمھارے رب کے سامنے الزام اتارنے کے لئے اور اس لئے کہ شاید وہ ڈریں ۱۶۴-۱۶۳

یہود کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ ہفتہ کا ایک دن (سنیچر) عبادت اور ذکر خدا کے لئے خاص رکھیں۔ اس دن کوئی معاشی کام نہ کریں۔ بائبل کے مطابق حکم یہ تھا کہ جو شخص سبت کے قانون کی خلاف ورزی کرے وہ مار ڈالا جائے (خروج ۳۱/۱۵) مگر جب یہود میں بگاڑ آیا تو وہ اس کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ان کے مصلحین نے متوجہ کیا تو وہ نہ مانے تاہم مصلحین نے اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کا کام اگرچہ بظاہر دوسروں کے لئے ہوتا ہے مگر وہ خود اپنے لئے کیا جاتا ہے، اس کا اصل محرک اپنے آپ کو اللہ کے یہاں بری الذمہ ٹھہرانا ہے۔ اگر یہ محرک زندہ نہ ہو تو آدمی درمیان میں ٹھیر جائے گا، وہ اپنے اصلاح اور تبلیغ کے عمل کو آخر وقت تک جاری نہیں رکھ سکتا۔

یہود کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ کو ان کے لئے اور سخت کر دیا گیا۔ بحر قلزم کی مشرقی خلیج کے کنارے ایلہ شہر میں یہود کی آبادیاں تھیں۔ ان کی معیشت کا انحصار زیادہ تر مچھلیوں کے شکار پر تھا۔ خدا کے حکم سے یہ ہوا کہ سنیچر کے دن ان کے ساحل پر مچھلیوں کی آمد بہت بڑھ گئی۔ بقیہ چھ دنوں میں مچھلیاں بہت کم آتیں۔ مگر ممنوعہ دن (سنیچر) کو وہ کثرت سے پانی کی سطح کے اوپر تیرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

یہ یہود کے لئے بڑی سخت آزمائش تھی۔ گویا پہلے اگر یہ نوعیت تھی کہ سنیچر کے علاوہ چھ جائز دنوں میں شکار کرنے کا پورا موقع تھا تو اب صرف ایک حرام دن ہی شکار کرنے کا موقع ان کے لئے باقی رہ گیا۔ اب یہود نے یہ کیا کہ وہ حیلہ کے ذریعہ حرام کو حلال کرنے لگے۔ وہ سنیچر کے دن شکار نہ کرتے۔ البتہ وہ سمندر کا پانی کاٹ کر باہر بنے ہوئے حوضوں میں لاتے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں چڑھتیں تو وہ نالی کے راستہ سے ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں۔ اس کے بعد وہ حوض کا منھ بند کر کے مچھلیوں کے دریا میں لوٹنے کا راستہ روک دیتے۔ پھر اگلے دن اتوار کو جا کر ان کو پکڑ لیتے۔ اس طرح وہ ایک ناجائز فعل کو جواز کی صورت دینے کی کوشش کرتے تاکہ ان پر یہ حکم صادق نہ آئے کہ انھوں نے سنیچر کے دن شکار کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جائز ذرائع سے اپنی ضروریات فراہم کرنے پر قناعت نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈالتا ہے کہ اس کے لئے جائز ذرائع کا دروازہ سرے سے بند کر دیا جائے اور ناجائز ذریعہ کے سوا اس کے لئے حصول معاش کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

پھر جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جو ان کو یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ پھر جب وہ بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ۱۶۶-۱۶۵

ایک کام جس سے خدا نے منع کیا ہو اس کو کرنا گناہ ہے اور حیلہ کے ذریعہ ناجائز کو جائز بنا کر کرنا گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ قانون سبت کی خلاف ورزی کر کے یہود اسی قسم کے مجرم بن گئے تھے۔ ایسے لوگ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کی ان عنایتوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس نے اس دنیا میں صرف انسان کے لئے مخصوص کی ہیں۔ ایسے لوگ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتے ہیں۔

قانون سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔ "اللہ نے ان کو بندر بنا دیا" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی صورت بندروں کی صورت ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اخلاق بندروں جیسا ہو گیا۔ ان کا دل اور ان کی سوچ انسانوں کے بجائے بندر جیسے ہو گئے (قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا وان لم تکن صورتھم کصورتھا، مفردات امام راغب۔ رُوی عن مجاھد انہ انما مسخت قلوبھم وردّت افھامھم کافھام القردۃ، تفسیر قرطبی)

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے اندر اس کے خالق نے عقل اور ضمیر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر جب کوئی خواہش اٹھتی ہے تو اس کی عقل و ضمیر متحرک ہو کر فوراً اس کے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیتے ہیں کہ ایسا کرنا تمھارے لئے درست ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس بندر کا حال یہ ہے کہ اس کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں۔ جو بات بھی اس کے جی میں آجائے وہ فوراً اس کو کر ڈالتا ہے۔ اس کو نہ اپنی خواہش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہوتی اور نہ اس پر عمل کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کی۔

اب انسان کا بندر ہو جانا یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنی ضمیر کے خلاف عمل کرتے کرتے اتنا بے حس ہو جائے کہ اس قسم کے نازک احساسات اس کے اندر سے جاتے رہیں۔ اس کے دل میں جو بھی خواہش پیدا ہو اس کو وہ کر گزرے۔ جب بھی کوئی شخص اس کی زد میں آجائے تو وہ اس کی عزت اور اس کے مال پر حملہ کر دے۔ کسی سے شکایت پیدا ہو تو فوراً اس کو ذلیل کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ کسی سے اختلاف ہو جائے تو اس پر غرانے لگے۔ کوئی اس کو اپنی راہ میں رکاوٹ نظر آئے تو فوراً اس سے لڑنا شروع کر دے۔ سچا انسان وہ ہے جو اپنے آپ پر خدا کی لگام لگا لے۔ اور بندر انسان وہ ہے جو بے قید ہو کر وہ سب کچھ کرنے لگے جو اس کا نفس اس سے کرنے کے لئے کہے۔

برائی سے روکنا ایک قسم کا اعلان برأت ہے۔ اس لئے کسی گروہ پر جب خدا کی یہ سزا آتی ہے تو اس کی زد میں آنے سے وہ لوگ بچا لئے جاتے ہیں جو برائی سے اس حد تک بیزار ہوں کہ وہ اس کے روکنے والے بن جائیں۔

اور جب تمھارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ یہود پر قیامت کے دن تک ضرور ایسے لوگ بھیجتا رہے گا جو ان کو نہایت برا عذاب دے۔ بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ہم نے ان کو گروہ گروہ کر کے زمین میں متفرق کر دیا۔ ان میں کچھ نیک ہیں اور ان میں کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم نے ان کی آزمائش کی اچھے حالات سے اور برے حالات سے تاکہ وہ باز آئیں ۱۶۸ — ۱۶۷

ان آیات میں یہود کے لئے جس سزا کا اعلان ہے اس کے ساتھ الیٰ یوم القیامہ (قیامت کے دن تک) کی شرط لگی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا وہ ہے جس کا تعلق دنیا سے ہے۔ آخرت کے انجام کا معاملہ اس سے الگ ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات پر آیا ہے۔

کسی کام کے کرنے پر جب بڑا انعام رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کو نہ کرنے پر اتنی ہی بڑی سزا بھی ہوگی۔ یہی معاملہ اس قوم کا ہے جو کتاب آسمانی کی حامل بنائی گئی ہو۔ یہود کو خدا نے اسی منصب پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ آخرت کے وعدہ کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو غیر معمولی انعامات دیے گئے۔ مگر یہود نے مسلسل نافرمانی کی۔ وہ دین کے نام پر بے دینی کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کو منصب فضیلت سے ہٹا دیا۔ ان کے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ جب تک دنیا قائم ہے وہ خدا کی سزا کا مزہ چکھتے رہیں گے۔ اور آخرت میں جو کچھ ہونا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک ان پر کبھی اچھے حالات نہیں آئیں گے۔ جیسا کہ خود ان آیات میں صراحت ہے، ان پر "حسنات" کے وقفے بھی پڑیں گے۔ مگر یہ حسنہ کا وقفہ بھی ان کے لئے ایک قسم کا عتاب ہوگا تاکہ وہ مزید سرکشی کر کے اور زیادہ سزا کے مستحق بنیں۔

ان آیات میں یہود کے لئے دو سزاؤں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ ان پر ایسی قومیں مسلط کی جائیں گی جو ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہود کبھی بخت نصر اور کبھی ٹیٹس رومی کے شدائد کا نشانہ بنے۔ کبھی وہ مسلمانوں کی ماتحتی میں دیے گئے۔ موجودہ زمانہ میں انھوں نے مشرقی یورپ میں اپنا زبردست اقتصادی جال پھیلایا تو ہٹلر نے انھیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اب ارض مقدس میں ان کا اجتماع بظاہر اس کی علامت ہے کہ ان کی پوری قوت شاید اجتماعی طور پر ہلاک کی جانے والی ہے۔

دوسری سزا جس کا یہاں ذکر ہے وہ "تقطیع" ہے۔ یعنی ان کی جمعیت کو مختلف حصوں میں بانٹ کر منتشر کر دینا۔ یہ دوسرا واقعہ بھی تاریخ میں بار بار ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

اللہ کا یہ قانون صرف یہود کے لئے نہیں تھا۔ وہ بعد کے اس گروہ کے لئے بھی ہے جس کو یہود کی معزولی کے بعد خدا کی گواہی کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنے کو اس حال میں پائیں کہ کفار و مشرکین نے ان پر غلبہ پا لیا ہو اور ان کی جمعیت چھوٹے چھوٹے جغرافیوں میں بٹ کر متفرق ہو گئی ہو تو ان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احتساب الٰہی کی زد میں آ گئے ہیں۔

پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ اور جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، بے شک ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اٹھایا گویا کہ وہ سائبان ہے۔ اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر آپڑے گا۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے، اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچو ۱۷۱ - ۱۶۹

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہود کو جب خدائی احکام دیے گئے تو اس کی کارروائی پہاڑ کے دامن میں ہوئی تھی۔ اس وقت ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ یہود کو محسوس ہوا کہ پہاڑ ان کے اوپر گرا چاہتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ خدا سے عہد باندھنے کا معاملہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اگر تم نے اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا تو یاد رکھو کہ اس عہد کا دوسرا فریق وہ عظیم ہستی ہے جو چاہے تو پہاڑ کو تمھارے اوپر گرا کر تمھیں ہلاک کر دے۔

اس وقت یہود میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اللہ سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے تھے۔ مگر بعد کو دھیرے دھیرے انھوں نے دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا۔ وہ جائز ناجائز کا فرق کیے بغیر مال جمع کرنے میں لگ گئے۔ آسمانی کتاب کو اب بھی وہ پڑھتے تھے مگر اس کی تعلیمات کی خود ساختہ تاویلیں کر کے اس کو انھوں نے ایسا بنا لیا کہ خدا بھی ان کو اپنی باغیانہ زندگی کا حامی نظر آنے لگا۔ ان کی بے حسی یہاں تک بڑھی کہ وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو گئے کہ ہم برگزیدہ امت ہیں۔ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ خدا اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں ہم کو ضرور بخش دے گا۔

یہی واقعہ ہر نبی کی امت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کے افراد خدا سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر اگلی نسلوں میں یہ روح نکل جاتی ہے۔ وہ دوسرے دنیادار لوگوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان اب بھی دین موجود ہوتا ہے۔ خدا کی کتاب اب بھی ان کے یہاں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب قومی وراثت کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً عہد خداوندی کے طور پر۔ وہ عملاً آخرت کو بھول کر دنیا پرستی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہشوں کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی فخر ہوتا ہے کہ وہ افضل الامم ہیں۔ وہ محبوب خدا کے امتی ہیں۔ وہ آسمانی کتاب کے وارث ہیں۔ کلمہ توحید کی برکت سے وہ ضرور بخش دیے جائیں گے۔

مگر اصل چیز یہ ہے کہ آدمی خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے، وہ نماز کو قائم کرے۔ اور کتاب الٰہی کو پکڑنے اور نماز کو قائم کرنے کا معیار یہ ہے کہ آدمی "مصلح" بن گیا ہو۔ خدا کی کتاب سے تعلق اور خدا کی عبادت کرنا آدمی کو مصلح بناتا ہے نہ کہ مفسد۔

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ یا کہو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے۔ تو کیا تو ہم کو ہلاک کرے گا اس کام پر جو غلط کار لوگوں نے کیا۔ اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں ۱۷۲-۱۷۴

ایک جانور کو اس کے ماں باپ سے الگ کر دیا جائے اور اس کی پرورش بالکل علیحدہ ماحول میں کی جائے تب بھی بڑا ہو کر وہ مکمل طور پر اپنی نسلی خصوصیات پر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں عین وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کی جبلت (Instinct) میں پیوست ہے۔ یہی معاملہ انسان کا "شعور رب" کے بارہ میں ہے۔ انسان کی روح میں ایک خالق و مالک کا شعور اتنی گہرائی کے ساتھ جما دیا گیا ہے کہ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ایک اعتبار سے روس اور دوسرے اعتبار سے ترکی کا تجربہ بتاتا ہے کہ مکمل طور پر مخالفِ مذہب ماحول میں تربیت پانے کے باوجود انسان کی فطرت عین وہی باقی رہتی ہے جو اقرارِ مذہب کے ماحول میں ہمیشہ پائی جاتی رہی ہے۔

تاہم جانور اور انسان میں ایک فرق ہے۔ جانور اپنی فطرت کی خلاف ورزی پر قادر نہیں۔ وہ مجبور ہیں کہ عملاً بھی وہی کریں جو ان کے اندر کی فطرت انھیں سبق دے رہی ہے۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ شعور فطرت کی حد تک پابند ہونے کے باوجود عمل کے معاملہ میں وہ پوری طرح آزاد ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس کی عقل اور اس کا ضمیر اندر سے اشارہ کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے اپنی اندرونی آواز کی پیروی کرے، چاہے اس کو نظر انداز کر کے من مانی کارروائی کرنے لگے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہو رہا ہے اور اسی پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ جو شخص خدائی آواز پر کان لگائے اور وہی کرے جو خدا فطرت کی خاموش زبان میں اس سے کہہ رہا ہے، وہ امتحان میں پورا اترا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دئے جائیں گے۔ اور جو شخص فطرت کی سطح پر نشر ہونے والی خدائی آواز کو نظر انداز کر دے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ اس کو مرنے کے بعد جہنم میں ڈالا جائے گا۔ خدا بھی اس کو نظر انداز کر دے گا جس طرح اس نے خدا کی آواز کو نظر انداز کیا تھا۔

فطرت کی یہ آواز ہر آدمی کے اوپر خدا کی دلیل ہے۔ اب کسی کے پاس نہ تو بے خبری کا عذر ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا کہ ماضی سے جو ہوتا چلا آ رہا تھا وہی ہم بھی کرنے لگے۔ جب انسان پیدائش ہی سے خدا کا شعور لے کر آتا ہے اور ماحول کے علی الرغم اس کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے تو اب کسی شخص کے پاس بے راہ ہونے کا کیا عذر ہے۔

اوران کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں۔ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہوتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کردے تو وہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں ۱۷۵ — ۱۷۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص امیہ بن ابی الصلت تھا۔ اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ وہ حکیمانہ کلام میں بھی ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کے آنے کی پیشین گوئیاں موجود ہیں تو اس کو گمان ہوا کہ شاید وہ پیغمبر میں ہی ہوں۔ بعد کو جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی خبر ملی اور اس نے آپ کا اعلیٰ کلام سنا تو اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ پیغمبر اسلام کا مخالف بن گیا۔ امیہ بن ابی الصلت کو خدا نے جو اعلیٰ خصوصیات دی تھیں ان کا صحیح استعمال یہ تھا کہ وہ خدا کے پیغمبر کو پہچانے اور ان کا ساتھی بن جائے۔ مگر خدا کی نوازشوں سے اس نے اپنے اندر یہ ذہن بنایا کہ اب خدا کو میرے سوا کسی اور پر اپنا فضل نہ کرنا چاہئے۔ پیغمبر خدا کو نہ ماننے میں اسے دنیوی فائدہ نظر آتا تھا اس کے برعکس آپ کو ماننے میں اخروی فائدہ تھا۔ اس نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی۔ وہ اگر اعراف کے رخ پر چلتا تو وہ فرشتوں کو اپنا ہم سفر بناتا۔ مگر جب وہ حسد اور گھمنڈ کے راستہ پر چل پڑا تو وہاں شیطان کے سوا کوئی اور نہ تھا جو اس کا ساتھ دے۔ یہ مثال ان تمام لوگوں پر صادق آتی ہے جو حسد اور کبر کی بنا پر سچائی کو نظر انداز کریں یا اس کو ماننے سے انکار کردیں۔

کسی آدمی کا ایسا بننا اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا کر کتے کے مقام پر پہنچا دینا ہے۔ کتا اچھے سلوک پر بھی ہانپتا ہے اور برے سلوک پر بھی۔ یہی حال ایسے آدمی کا ہے۔ خدا نے جب اس کو دیا تب بھی اس نے اس سے سرکشی کی غذا لی اور نہ دیا تب بھی وہ سرکش ہی بنا رہا۔ حالاں کہ چاہئے یہ تھا کہ جب خدا نے اس کو دیا تھا تو وہ اس کا احسان مند ہوتا اور جب خدا نے نہیں دیا تو وہ خدا کی تقسیم پر راضی رہ کر اس کی طرف رجوع کرتا۔

کسی کو راستہ دکھانے کے لئے خدا خود سامنے نہیں آتا بلکہ وہ نشانیوں (دلائل) کی صورت میں اپنا راستہ لوگوں کے اوپر کھولتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ دلائل اور نشانیوں کے روپ میں ظاہر ہونے والے حق کو پہچان لیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائیں وہی اس دنیا میں ہدایت یاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ دلائل اور نشانیوں کو اہمیت نہ دیں ان کے لئے ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور ہم نے جنات اور انسان میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔ اور اللہ کے لئے ہیں سب اچھے نام۔ پس انھیں سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ وہ بدلہ پاکر رہیں گے اپنے کاموں کا۔ اور ہم نے جن کو پیدا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میرا داؤ بڑا مضبوط ہے ۱۸۳ — ۱۷۹

سچائی ایک ایسی چیز ہے جس کو ہر آدمی کو خود پانا پڑتا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو دل اور آنکھ اور کان دئے ہیں۔ آدمی انھیں صلاحیتوں کو استعمال کرکے سچائی کو پاتا ہے۔ اور جو شخص ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرے وہ یقیناً سچائی کو پانے سے محروم رہے گا، خواہ سچائی اس سے کتنا ہی زیادہ قریب موجود ہو۔

سچائی کو پانا ہر آدمی کا ایک شعوری اور ارادی فعل ہے۔ سچائی کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھے ہوں۔ اس کو وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہ ڈالے ہوں۔ اس کی آواز اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس نے اپنے کان میں کسی قسم کے ڈاٹ نہ لگا رکھے ہوں۔ ایسے لوگ سچائی کی آواز کو پہچان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دیں گے۔ اور جس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہو وہ چوپایوں کی طرح ناسمجھ بنا رہے گا۔ پہاڑ جیسے دلائل کا وزن محسوس کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کے سامنے خدا کی تجلیاں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہوگا۔ اس کے پاس خدا کا نغمہ چھیڑا جائے گا مگر وہ اس کو سننے سے محروم رہے گا۔ سچائی ہمیشہ بیدار لوگوں کو ملتی ہے۔ غافلوں کے لئے کوئی سچائی سچائی نہیں۔

خدا کے بارے میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہوئے اپنے ذہن میں خدا کی غلط تصویر بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔ مثلاً انسانوں کے حالات پر قیاس کرکے خدا کے مقربین کا عقیدہ بنا لینا۔ بادشاہوں کو دیکھ کر یہ فرض کر لینا کہ جس طرح بادشاہوں کے نائب اور مددگار ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی نائب اور مددگار ہیں۔ خدائی فیصلہ کے بارے میں ایسا خیال قائم کر لینا جس میں آدمی کی اپنی خواہشیں تو پوری ہو رہی ہوں مگر وہ خداوندی عدل سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہ خدا کے ناموں میں کجی کرنا ہے کہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کی عظمت کے شایان شان نہ ہوں۔

خدا کسی آدمی کی کج روی پر فوراً اس کو نہیں پکڑتا۔ اس طرح اس کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ یا تو خدا کی تنبیہات کو دیکھ کر سنبھل جائے یا مزید ڈھیٹ ہو کر اپنے جرم کو پوری طرح ثابت شدہ بنا دے۔

کیا ان لوگوں نے غور نہیں کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک صاف ڈرانے والا ہے۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام پر نظر نہیں کی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے ہر چیز سے اور اس بات پر کہ شاید ان کی مدت قریب آگئی ہو۔ پس اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے جس کو اللہ بے راہ کر دے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اور وہ ان کو سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا۔ کہو اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ بھاری ہو رہی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ وہ جب تم پر آئے گی تو اچانک آجائے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی تحقیق کر چکے ہو۔ کہو اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ کہو میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں ۱۸۸—۱۸۴

بامقصد آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مصلحت پسند انسان ہوتا ہے۔ وہ وقت کے رواج سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ وہ ماحول میں جمے ہوئے مصالح سے بے پروا ہو کر اپنا کام کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے نشانہ کی خاطر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیتا ہے جس کا کوئی نتیجہ بظاہر اس دنیا میں ملنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بامقصد آدمی کو اکثر اپنے معاصرین کی طرف سے جو سب سے بڑا خطاب ملتا ہے وہ "مجنون" ہے۔ خدا کا پیغمبر اپنے وقت کا سب سے بڑا بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لئے خدا کے پیغمبروں کو ہر زمانہ کے لوگوں نے یہی کہا کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں۔

خدا کے دین کے داعی کو مجنون کہنا تمام ظلموں میں سب سے بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ وہ جس پیغام کو لے کر اٹھتا ہے وہ ایک ایسا پیغام ہے جس کی تصدیق تمام زمین و آسمان کر رہے ہیں۔ وہ ایسے خدا کی طرف بلاتا ہے جو اپنی کائناتی تخلیقات میں ہر طرف انتہائی حد تک نمایاں ہے۔ وہ ایسی آخرت کی خبر دیتا ہے جو زمین و آسمان میں اسی طرح سنگین حقیقت بنی ہوئی ہے جس طرح کسی ماں کے پیٹ میں پورا حمل۔ لوگ حق کے بارے میں سنجیدہ نہیں، اس لئے حق کی خاطر جان کھپانے والا انھیں مجنون دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ حق کی قدر و قیمت کو جانتے تو کبھی ایسا نہ کہتے۔

"قیامت کس تاریخ کو آئے گی" اس قسم کے سوالات غیر سنجیدہ ذہن سے نکلے ہوئے سوالات ہیں۔ قیامت کو ماننے کا انحصار قیامت کے حق میں اصولی دلیل پر ہے نہ کہ اس بات پر کہ قیامت کی تاریخ متعین صورت میں بتا دی جائے۔ جب یہ دنیا دارالامتحان ہے تو یہاں قیامت کو تنبیہ کی زبان میں بتایا جائے گا نہ کہ حسابی تعینات کی زبان میں۔

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اس کو ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ پھر وہ اس کو لئے پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ اپنے رب سے دعا کی، اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ہم تیرے شکرگزار رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو تندرست اولاد دے دی تو وہ اس کی بخشی ہوئی چیزیں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا وہ شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لئے پکارو تو وہ تمہاری پکار پر نہ چلیں گے۔ برابر ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس تم ان کو پکارو، وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو ۱۹۴ — ۱۸۹

کائنات اپنے خالق کا جو تعارف کراتی ہے وہ ایسا تعارف ہے جو کسی حال میں شرک کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ کائنات میں بے شمار اجزار الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ مگر تمام اجزار مل کر ایک ہم آہنگ کل بن جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تضاد یا ٹکراؤ نہیں۔ یہ کامل ہم آہنگی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک ہو اور وہی تنہا اس کو چلا رہا ہو۔

مرد اور عورت کے معاملہ کو دیکھئے۔ ایک مرد اور ایک عورت میں جو کامل مطابقت ہوتی ہے وہ شاید موجودہ کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے جس کا تجربہ ایک شخص کرتا ہے۔ مرد ایک منفرد اور مستقل وجود ہے اور عورت اس سے الگ ایک مستقل وجود۔ مگر یہ مرد اور عورت جب میاں اور بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں کا وجود اس طرح ایک دوسرے میں شامل ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی دوئی باقی نہیں رہتی۔ ہر ایک کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اُس کے لئے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ میرے لئے۔ دونوں کے درمیان یہ گہری سازگاری اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی ارادہ نے اپنے پیشگی منصوبہ کے تحت دونوں کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے۔ کائنات میں اگر ایک سے زیادہ ہستیوں کی کارفرمائی ہوتی تو دو مختلف اور متضاد چیزوں کے درمیان یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ جس کائنات میں توحید کے اتنے زیادہ دلائل موجود ہیں وہاں آدمی شرک کو اپنا مذہب بناتا ہے۔ دو انسانوں میں "وحدت" کے کرشمہ سے ایک تیسرے بچہ نے جنم لیا مگر جب وہ پیدا ہو گیا تو کسی نے یہ عقیدہ بنا لیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ بزرگ کی برکت سے ہوئی ہے۔ کسی نے اس کو مفروضہ دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا۔ کسی نے کہا کہ یہ مادہ کی اندھی طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہے۔ کسی نے یہ سمجھا کہ یہ خود اس کی اپنی کمائی ہے جو ایک خوبصورت بچہ کی صورت میں اس کو حاصل ہوئی ہے۔

کیا ان کے پاؤں ہیں کہ ان سے چلیں۔ کیا ان کے ہاتھ ہیں کہ ان سے پکڑیں۔ کیا ان کے آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھیں۔ کیا ان کے کان ہیں کہ ان سے سنیں۔ کہو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ۔ پھر تم لوگ میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ یقیناً میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ کارسازی کرتا ہے نیک بندوں کی۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو راستہ کی طرف پکارو تو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم کو نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر وہ کچھ نہیں دیکھتے ۱۹۸ — ۱۹۵

بت پرست لوگ پتھر یا دھات کی جو مورتیاں بناتے ہیں اس کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خارجی مظاہر ہیں جن کے اندر ان کا مزعومہ دیوتا حلول کر آیا ہے۔ ان مظاہر کی پرستش ان کے نزدیک اُن معبودوں کی پرستش ہے جن کی وہ محسوس علامتیں ہیں۔ تاہم عوام کی سطح پر عملاً بت پرستی جو شکل اختیار کرتی ہے وہ یہ کہ لوگ خود ان مورتیوں کو مقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ ان بتوں میں نہ چلنے کی طاقت ہوتی، نہ پکڑنے کی، نہ دیکھنے کی اور نہ سننے کی۔ مگر وہمی انسان ان کی بابت یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ اس کے کام آئیں گے اور اس کی حاجتیں پوری کریں گے۔

تاہم یہ معاملہ معروف قسم کے بتوں ہی کا نہیں ہے۔ ان کے سوا جن چیزوں کو انسان معبودیت کا درجہ دیتا ہے ان کا حال بھی یہی ہے، وطن اور قوم سے لے کر زندہ یا مردہ شخصیتوں تک جن جن چیزوں سے بھی وہ جذبات وابستہ کئے جاتے ہیں جو صرف ایک خدا کا حق ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ کوئی بھی پاؤں یا ہاتھ یا آنکھ والا ایسا نہیں جس کے پاؤں اور ہاتھ اور آنکھ اس کے اپنے ہوں۔ ہر "پاؤں" والے کے پاس دیا ہوا پاؤں ہے اور اگر اس کا پاؤں چھن جائے تو وہ اس کو دوبارہ واپس نہیں لا سکتا۔ ہر "ہاتھ" والے کے پاس دیا ہوا ہاتھ ہے اور اگر اس کا ہاتھ باقی نہ رہے تو وہ دوبارہ اپنا ہاتھ نہیں بنا سکتا۔ ہر "آنکھ" والے کی آنکھ دی ہوئی آنکھ ہے اور اگر اس کی آنکھ جاتی رہے تو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دوبارہ اپنے لئے آنکھ تیار کرلے۔

غیر اللہ کی پرستش کرنے والے لوگ اپنے بتوں کے بھروسہ پر ہمیشہ ایک خدا کے پرستاروں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت جلد جان لیں گے کہ خدا کی اس دنیا میں ان کا بھروسہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ جس خدا کا ظہور موجودہ دنیا میں کتابی میزان کی صورت میں ہوا ہے، اس کا ظہور عنقریب عدالتی میزان کی صورت میں ہونے والا ہے۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا کہ کام بنانے والا صرف خدا تھا، اگرچہ آدمی اپنی نادانی کی وجہ سے دوسروں کو اپنا کام بنانے والا سمجھتا رہا۔ شریکوں کے پاس تو سرے سے مدد کرنے کی کوئی طاقت ہی نہیں، مگر خدا اپنے وفادار بندوں کی مدد دنیا میں بھی کرتا ہے اور آخرت میں بھی۔

درگزر کرو۔ نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے ۲۰۲ - ۱۹۹

توحید اور آخرت، نیکی اور عدل کی طرف بلانا "عُرف" کی طرف بلانا ہے۔ یعنی ان بھلائیوں کی طرف جو عقل و فطرت کے نزدیک جانی پہچانی ہیں۔ مگر یہ سادہ ترین کام ہر زمانہ میں مشکل ترین کام رہا ہے۔ انسان کی حُبِ عاجلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگ اپنی زندگی کا نظام دنیوی مفاد اور ذاتی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ حق کا نام لے کر باطل پرستی کے مشغلہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب بھی سچائی کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر آدمی اپنے آپ پر اس کی زد پڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ایسی حالت میں داعی کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے درگزر اور اعراض۔ یعنی لوگوں سے الجھے بغیر بالکل ٹھنڈے طور پر اپنا کام جاری رکھنا۔ داعی اگر لوگوں کے نکالے ہوئے شوشوں کا جواب دینے لگے تو حق کی دعوت مناظرہ کی صورت اختیار کرے گی۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے چھیڑے ہوئے غیر ضروری سوالات میں اپنے کو مشغول کرے تو وہ صرف اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ضائع کرے گا۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر ان سے جھگڑنے لگے تو دعوت حق دعوت حق نہ رہے گی بلکہ معاشی اور سیاسی لڑائی بن جائے گی۔ اس لئے حق کی دعوت کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ داعی جاہلوں اور معاندوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں پر صبر کرے اور ان سے الجھے بغیر اپنے مثبت کام کو جاری رکھے۔

تاہم موجودہ دنیا میں کوئی شخص نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھی بن کر وہ کس گڑھے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔

اور جب تم ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) نہیں لائے تو کہتے ہیں کہ کیوں نہ تم چھانٹ لائے کچھ اپنی طرف سے۔ کہو: میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں، عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے، اور غافلوں میں سے نہ ہو۔ جو (فرشتے) تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ اور وہ اس کی پاک ذات کو یاد کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں

۲۰۳ — ۲۰۶

مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ اگر تم خدا کے پیغمبر ہو تو خدا کے یہاں سے کوئی معجزہ کیوں نہیں لائے۔ خدا کے لئے انتہائی آسان تھا کہ وہ آپ کو ایک معجزہ دے دیتا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اصل مقصد جاتا رہتا۔

مثلاً فرض کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جدید طرز کی ایک موٹر کار اتار دی جاتی جس میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہوتا۔ آپ اس میں بیٹھ کر چلتے اور لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں ایسی ایک کار لوگوں کے لئے انتہائی حیرت ناک معجزہ ہوتی۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوتا کہ لوگوں کی توجہ اصل بات سے ہٹ جاتی۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خدا کا کلام لوگوں کے لئے بصیرت بنے۔ اس سے لوگوں کو سوچنے کا ڈھنگ اور عمل کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ اس سے روحوں کو خدائی ٹھنڈک ملے۔ مگر مذکورہ معجزہ کے بعد یہ سارا منصوبہ دھرا رہ جاتا اور لوگ بس طلسماتی سواری کے عجوبہ میں محو ہو کر رہ جاتے۔

کراماتی چیزوں میں کھونے کا نام دین نہیں۔ دین یہ ہے کہ آدمی خدا کے کلام پر دھیان دے۔ اس کو غور کے ساتھ پڑھے اور توجہ کے ساتھ سنے۔ دین دار ہونے کی پہچان یہ ہے کہ خدا کے ساتھ آدمی کا گہرا تعلق قائم ہو جائے۔ اس کے دل میں گداز پیدا ہو۔ وہ خدا کی یاد کرنے والا بن جائے۔ خدا کی عظمت اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ اس کے اندر تواضع اور خوف کی کیفیت پیدا کر دے۔ خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی آواز پست ہو جائے۔ وہ غفلت سے نکل کر بیداری کے عالم میں پہنچ جائے۔

آخر میں فرشتوں کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ تم بھی ایسا ہی کرو تاکہ تمھیں فرشتوں کی معیت حاصل ہو۔ جب آدمی اپنے آپ کو گھمنڈ سے پاک کرتا ہے۔ اور خدا کے کمالات سے اتنا سرشار ہوتا ہے کہ اس کے دل سے ہر وقت اس کی یاد ابلتی رہتی ہے تو وہ فرشتوں کا ہم سطح ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کسی انسان کی ترقی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے ملکوتی کردار کا حامل بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے فرشتوں کے پڑوس میں زندگی گزارنے لگے۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہ تم سے انفال (مال غنیمت) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے توان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے ۴ ـ ۱

سورۂ انفال جنگ بدر (۲ ھ) کے بعد اتری۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی اور اس کے بعد میدان جنگ سے کافی مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ مگر یہ اموال عملاً ایک گروہ کے قبضہ میں تھے۔ اس بنا پر جنگ کے بعد غنیمت کی تقسیم پر نزاع پیدا ہوگئی۔ جنگ میں کچھ لوگ پچھلی صف میں تھے۔ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ آخری مرحلہ میں دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس طرح میدان جنگ سے مال غنیمت لوٹنے کا موقع ایک خاص فریق کو ملا۔ دوسرے لوگ جو اس وقت میدان جنگ سے دور تھے وہ دشمن کے چھوڑے ہوئے اموال کو حاصل نہ کر سکے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اصولی طور پر تو جنگ کے تمام شرکاء اپنے کو مال غنیمت میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ مگر مال غنیمت عملاً صرف ایک گروہ کے قبضہ میں تھا۔ ایک فریق کے پاس دلیل تھی اور دوسرے فریق کے پاس مال۔ ایک کے پاس اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے صرف الفاظ تھے۔ جبکہ دوسرے کا حق کسی دلیل و ثبوت کے بغیر خود قبضہ کے زور پر قائم تھا۔

اس قسم کے تمام جھگڑے خدا کے خوف کے منافی ہیں۔ خدا کا خوف آدمی کے اندر ذمہ داری کی نفسیات ابھارتا ہے۔ ایسے آدمی کی توجہ فرائض پر ہوتی ہے نہ کہ حقوق پر۔ وہ اپنی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا دل خدا و رسول کی اطاعت کے لئے نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کو دے کر اسے تسکین ملتی ہے نہ کہ لوگوں سے چھین کر۔ یہ اوصاف آدمی کے اندر حقیقت پسندی اور حق کے اعتراف کا مادہ پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی اور اعتراف حق کی فضا کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اتفاقاً ابھرتے ہیں تو ایک بار کی تنبیہ ان کی اصلاح کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

خدا کی پکڑ کا اندیشہ ہر ایک کو اس حد پر پہنچا دیتا ہے جس حد پر اس کو فی الواقع ہونا چاہئے تھا۔ اور جہاں ہر آدمی اپنی واقعی حد پر رکنے کے لئے راضی ہو جائے وہاں جھگڑے کا کوئی گزر نہیں۔

جیسا کہ تمھارے رب نے تم کو حق کے ساتھ تمھارے گھر سے نکالا۔ اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تم سے جھگڑ رہے تھے باوجودیکہ وہ ظاہر ہو چکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں آنکھوں دیکھتے۔ اور جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تم کو مل جائے گی۔ اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے۔ اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے اپنے کلمات سے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو ۸ — ۵

شعبان ۲ھ میں معلوم ہوا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جا رہا ہے۔ اس قافلہ کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار اشرفی کا سامان تھا۔ اس کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے قافلۂ تجارت پر حملہ کریں۔ چنانچہ قافلہ کے سردار ابوسفیان بن حرب نے تیز رفتار اونٹنی کے ذریعہ مکہ والوں کے پاس یہ خبر بھیجی کہ مدد کے لئے دوڑو ورنہ مسلمان تجارتی قافلہ کو لوٹ لیں گے۔ مکہ میں اس خبر سے بڑا جوش پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۹۵۰ سوار جن میں ۶۰۰ زرہ پوش تھے مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تمام خبریں مل رہی تھیں۔ اب مدینہ کے مسلمان دو گروہوں کے درمیان تھے۔ ایک شام سے آنے والا تجارتی قافلہ۔ دوسرا مکہ سے مدینہ کی طرف بڑھنے والا جنگی لشکر۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ تجارتی قافلہ کی طرف بڑھا جائے۔ اس قافلہ کے ساتھ بمشکل ۴۰ محافظ تھے۔ اس کو بآسانی مغلوب کر کے اس کے سامان پر قبضہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر خدا کا منصوبہ دوسرا تھا۔ خدا کو دراصل منکرین حق کا زور توڑنا تھا نہ کہ کچھ اقتصادی فائدہ حاصل کرنا۔ خدا نے مخصوص حالات پیدا کر کے ایسا کیا کہ تمام مخالف سرداروں کو مکہ سے نکالا اور ان کو مدینہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر بدر کے مقام پر پہنچا دیا تاکہ مسلمانوں کو ان سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لئے ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اللہ کے رسول نے جب مسلمانوں کو خدا کے اس منصوبہ سے مطلع کیا تو سب کے سب متفق ہو کر بدر کی طرف بڑھے۔ ان کی تعداد اگرچہ صرف ۳۱۳ تھی۔ ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔ مگر اللہ نے ان کی خصوصی مدد فرمائی۔ انھوں نے قریش کے لشکر کو بری طرح شکست دی۔ ان کے ستر سردار قتل ہوئے اور ستر گرفتار کر لئے گئے۔ بدر کا میدان کفر کے مقابلہ میں اسلام کی فتح کا میدان بن گیا —— جب بھی ایسا ہو کہ ایک طرف مادی فائدہ ہو اور دوسری طرف دینی فائدہ تو یہ تقسیم خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کی مرضی دینی فائدہ کی طرف ہے نہ کہ مادی فائدہ کی طرف۔

اسلامی جدوجہد کا نشانہ کبھی معاشی مفاد حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ اسلامی جدوجہد کا نشانہ ہمیشہ باطل کا زور توڑنا ہوتا ہے۔ خواہ وہ نظریاتی طاقت کے ذریعہ ہو یا حالات کے اعتبار سے مادی طاقت کے ذریعہ۔

برائی کی علامت

۱۳ مئی ۱۹۸۱ کو دنیا کی سب سے زیادہ گرما گرم خبر یہ تھی کہ ویٹکن (اٹلی) کے پوپ جان پال دوم پر ایک شخص نے پستول سے قاتلانہ حملہ کیا۔ پوپ شدید طور پر زخمی ہوئے تاہم وہ بچ گئے۔

حملہ کرنے والا ایک ترک نوجوان محمد علی اغسا تھا۔ اس کو پولیس نے فوراً گرفتار کر لیا۔ پوچھ تاچھ کے دوران محمد علی اغسا نے بتایا کہ وہ مظلوم اور پس ماندہ قوموں کا حامی ہے۔ وہ دنیا کے ایک ایسے بڑے کو قتل کرنا چاہتا تھا جو سامراج کی علامت (Symbol of Imperialism) ہو۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر ان کو چھوڑ دیا کہ وہ ایک عورت ہے۔ اس کے بعد اس نے چاہا کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کو قتل کرے۔ مگر وہ امریکہ میں رہتے ہیں اور امریکہ پہنچنے کے ذرائع اس کے پاس نہ تھے۔ بالآخر اس نے اٹلی کے پوپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ محمد علی اغسا ایک مخلص مسلمان ہے۔ وہ فرائض کا پابند ہے۔ وہ شراب اور سگریٹ اور سور کے گوشت سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ مظلوم انسانوں کا اس کو اتنا درد ہے کہ اس نے بستر پر سونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ رات کے وقت کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی میز پر سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سوتا ہے اور اس کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ترک نوجوان کی یہ کہانی موجودہ زمانہ میں ہمارے بیشتر لیڈروں کی کہانی ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے یہ کیا کہ کسی حکمراں، کسی لیڈر، کسی قوم یا کسی خاندان کو برائی کی علامت قرار دے لیا اور بس اس کو نیچا دکھانے یا اس کو ختم کرنے میں اپنی ساری طاقت لگا دی۔ ہمارے لیڈروں میں سے اکثر اس اعتبار سے کامیاب رہے کہ انھوں نے جس کو برائی کی علامت سمجھا تھا اس کا کسی نہ کسی طرح خاتمہ ہو گیا مگر اس کے باوجود برائی اپنی پوری طاقت کے ساتھ باقی رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ برائی کا بے حد ناقص اندازہ ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کسی خاص شخص یا خاص گروہ میں مجسم ہوئی ہے۔ اس قسم کی چیز فوری شہرت اور قیادت حاصل کرنے میں ضرور کارآمد ہو سکتی ہے، مگر اس قسم کی چیزوں سے کبھی برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ برائی کی جڑیں ہمیشہ اس سے بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ ایک علامتی شخصیت کو ہلاک کر کے ان کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہ دراصل سستا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے اور سستا کریڈٹ خدا کی اس محکم کائنات میں کبھی کسی کو نہیں ملتا۔

داعیانہ اخلاق کی ضرورت

ایک شخص تاجر کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے، دوسرا شخص داداگیری کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہو تو دونوں کا اخلاق یکساں نہیں ہوسکتا۔ تاجر کا اخلاق اور ہوگا اور داداگیری کرنے والے کا اور۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ جو شخص یا گروہ حق کا داعی بنے ضروری ہے کہ اس کی اخلاقیات بھی اس کے مطابق ہوں۔ اگر وہ زبان سے داعی ہونے کا مدعی ہو مگر اس کا اخلاق غیر داعیانہ ہو تو وہ لوگوں کی نظر میں مسخرہ بن کر رہ جائے گا، وہ داعی کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

انتہائی لازمی طور پر ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان غیر دعوتی امور پر جھگڑے نہ کھڑے کیے جائیں۔ غیر دعوتی جھگڑے اس فضا ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس میں داعی اپنی دعوت پیش کرے اور مدعو اس کو سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ سنے۔

تاہم یہ دعوتی فضا داعی سے بہت بڑی قیمت مانگتی ہے۔ یہ قیمت صبر ہے۔ داعی کو ارادی اور شعوری طور پر یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ نقصانات اور تکلیفوں پر صبر کرے گا۔ حضرت مسیح کے تمثیلی الفاظ میں مدعو اگر اس کا کرتا چھینے تو وہ اس کو اپنا چغہ بھی دینے کے لئے تیار رہے۔ مدعو اگر ایک کوس بیگار چلنے کو کہے تو وہ دو کوس بیگار چلا جائے۔ تاکہ کوئی غیر متعلق جھگڑا کھڑا ہو کر دونوں کے درمیان ایسی صورت نہ پیدا کر دے کہ سننے اور سنانے کا ماحول ہی ختم ہو جائے۔

ماں اپنے بچہ کو دوا کھلانا چاہتی ہو اور اس وقت بچہ کوئی دوسری ضد شروع کر دے تو ماں بچہ کی اس ضد کی راہ میں حائل نہیں ہوتی کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دوا کھلانے کا کام رک جائے اور بچہ اور ماں کے درمیان ساری نزاع ایک غیر متعلق ضد پر ہونے لگے۔ اسی طرح داعی کو چاہئے کہ مدعو کے ہر وار کو اپنے اوپر سہتا رہے تاکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم رہے اور داعی اپنی اصل بات کو مدعو کے دل میں اتار سکے۔ مدعو گروہ سے دوسری دوسری شکایتوں پر کش مکش صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے ذہنوں میں اپنے داعی ہونے کا شعور ختم ہو گیا ہو جنھوں نے اپنی داعیانہ حیثیت کھو دی ہو اور وہ دوسری قوموں کی طرح محض ایک قوم بن کر رہ گئے ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر سے داعیانہ شعور ختم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں بالکل قومی بن کر رہ گئی ہیں۔ اس روش نے مسلمانوں کو خدا کی نصرت سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ خدا کی نصرت دعوت الی اللہ کے لئے اٹھنے والوں کو ملتی ہے نہ کہ قومی جھگڑا کرنے والوں کو۔

بد دعا سے بچنا اور ہمیشہ اچھی دعا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے اپنے حق میں دعا کے لئے کہتا تو آپ فوراً انھیں الفاظ میں اس کے لئے دعائیہ کلمات کہتے جن الفاظ میں اس نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے اپنی مشرک ماں کے لئے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا: اے خدا کے رسول! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (ادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرۃ) آپ نے فوراً دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (اللھم اھد ام ابی ھریرۃ) نیز حسب موقع اس میں کچھ بہتر الفاظ کے ساتھ اضافہ فرما دیتے۔ ایک بار حضرت ابوہریرہ نے آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول میرے لئے خدا سے دعا کر دیجئے کہ وہ مجھ کو اور میری ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے (ادع اللہ ان یحببنی وامی الیٰ عبادہ المومنین) آپ نے فرمایا: اے اللہ ابوہریرہ اور ان کی ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے اور اپنے مومن بندوں کو ان دونوں کے لئے محبوب کر دے (اللھم حبب عبیدک ھذا وامہ الیٰ عبادک المومنین وحببھم الیھما)

یہ طریقہ آپ کا اچھی دعا کے لئے تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص بد دعا کے لئے کہتا تو اس صورت میں آپ کا طریقہ دوسرا ہوتا۔ اب آپ آدمی کی درخواست کے برعکس اس کے لئے بہتری کی دعا کرنے لگتے۔ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس جا کر قبیلہ دوس میں تبلیغ کرنے لگے۔ مگر ان کی بیوی کے والد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، قبیلہ دوس کے لئے بد دعا فرمائیے۔ آپ نے حضرت طفیل سے کوئی بحث نہ کی بلکہ ان الفاظ میں دعا کرنا شروع کر دیا: اے اللہ قبیلہ دوس کے لوگوں کو ہدایت دے (اللھم اھد دوسا) اس کے بعد حضرت طفیل نے دوبارہ اپنے قبیلہ میں واپس آکر تبلیغ کی تو سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ انھیں میں سے ایک حضرت ابوہریرہ بھی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ واقعات میں جو طریقہ ملتا ہے یہی مومن کا اصل مزاج ہے۔ مومن کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی ایک مومن کے لئے وہی بہتر چیز چاہنے لگتا ہے جس کا وہ مومن خود خواہاں ہو۔ مومن دوسرے کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے، اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص صحیح راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے حق میں خدا سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کا سینہ ہدایت کے لئے کھول دے۔

نجات کی دو شرطیں

آخرت میں نجات کن لوگوں کو حاصل ہوگی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دو شرطوں میں سے کم از کم ایک شرط کا ثبوت دیا ہو۔ اول وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں ظلم کو شامل نہیں کیا ——— اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم نہیں ملایا انھیں کے لئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں (انعام ۸۲)

یہاں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جو آدمی کے لئے یقین کے ہم معنی بن جاتا ہے اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ جو لوگ اللہ کو اس طرح پائیں کہ وہ ان کی نفسیات کا جزء بن کر ان کے اوپر چھا جائے۔ وہ ان کے دل و دماغ کو اپنے احاطہ میں لے لے۔ ان کا ایمان اور ان کا سوچنا اور چاہنا الگ الگ نہ رہیں بلکہ دونوں ایک ہو جائیں۔ ان کا یقین و اعتماد، ان کا خوف و محبت، ان کی دلچسپیاں اور وفاداریاں سب اسی کے لئے ہو جائیں جو ان کا ایمان باللہ ان سے تقاضا کرتا ہے۔ ایسے لوگ اعلیٰ ترین معنی میں ہدایت یافتہ مومن ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ میں جیتے ہیں۔ ان کا سب کچھ اللہ بن جاتا ہے۔ وہ دنیا کی زندگی ہی میں خدا کی پناہ میں آچکے ہوتے ہیں۔ اور جو دنیا ہی میں خدا کی پناہ حاصل کر چکا ہو اس کے متعلق کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ آخرت میں محروم ہوگا۔

دوسرا درجہ وہ ہے جس کو "اعتراف" کہا گیا ہے ——— اور کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے نیک عمل کے ساتھ برا عمل ملا دیا۔ بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ وہ بخشنے والا مہربان ہے (توبہ ۱۰۲) پہلے گروہ کے لئے اگر "عمل" باعث نجات بنے گا تو دوسرے گروہ کے لئے "اعتراف"۔ آدمی کو اپنے رب کے سامنے یا کامل عمل پیش کرنا ہے یا کامل اعتراف۔ ان دو کے بعد نجات کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

آدمیوں میں کچھ مضبوط ارادہ کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ کمزور ارادہ کے لوگ۔ مضبوط ارادہ کے لوگ جب دل سے اللہ کا اقرار کر لیتے ہیں تو ان کا عمل ان کے اقرار سے الگ نہیں رہتا۔ وہ اپنے عمل میں بھی وہی بن جاتے ہیں جو وہ اپنے دل کے اندر بنے ہیں۔ مگر کمزور ارادہ کے لوگ اپنے اقرار اور اپنے عمل میں اتنی یکسانی پیدا نہیں کر پاتے۔ وہ بار بار شیطان اور نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم ایسے لوگوں کے لئے بھی اللہ کے یہاں رحمتوں کا سایہ ہے۔ مگر یہ سایہ اس شرط پر ہے کہ انھوں نے ڈھٹائی کے بجائے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے تاویلوں کا سہارا لینے کے بجائے کھلے طور پر اقرار کر لیا ہو۔ وہ بحث کرنے کے بجائے چپ ہو گئے ہوں۔ جب ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تو بپھرنے کے بجائے انھوں نے اپنا سر جھکا لیا ہو۔ جن کے اوپر عزت نفس کے بجائے شرمندگی طاری ہوئی ہو۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ اپنے رب کے سامنے حسن عمل نہ پیش کر سکے ہوں تو انھوں نے اپنے رب کے سامنے عجز کے آنسو پیش کئے ہوں۔ جو لوگ یہ آخری چیز بھی نہ پیش کر سکیں ان کو خدا بخشے گا تو کس بہانے بخشے گا۔

بحث وجدال تنزل کی علامت ہے

قال الاوزاعی بلغنی ان اللہ اذا اراد بقوم شراً الزمھم الجدل ومنعھم العمل (ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ جزء ثانی، صفحہ ۹۳ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر (اللہ جب کسی قوم کے لئے شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو جدال میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کو عمل سے روک دیتا ہے)

مومن کی لذت غصہ کو پی جانے میں ہے نہ کہ غصہ کو ظاہر کرنے میں

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی بندہ کے لئے دودھ یا شہد کا گھونٹ پینا اتنا شیریں نہیں جتنا غصہ کا گھونٹ پی لینا (ما تجرع عبد جرعۃ من لبن او عسل خیر من جرعۃ غیظ، رواہ احمد)

مومن کی جنگ فتنہ کو ختم کرنے کے لئے نہ کہ فتنہ کو پیدا کرنے کے لئے

نافع رض سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رض کے پاس عبداللہ بن زبیر رض کے فتنہ میں دو آدمی آئے اور کہا: لوگ تباہ ہو گئے۔ آپ عمر فاروق رض کے صاحبزادے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ پھر آپ کو نکلنے میں کیا چیز مانع ہے۔ عبداللہ بن عمر رض نے فرمایا: میرے لئے یہ چیز مانع ہے کہ اللہ نے میرے لئے میرے بھائی کے خون کو حرام کر دیا ہے۔ دونوں آدمیوں نے کہا: کیا اللہ نے اپنی کتاب میں نہیں فرمایا ہے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) عبداللہ بن عمر رض نے جواب دیا: ہم لوگوں سے لڑے یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا۔ اور تم لوگ چاہتے ہو کہ تم لڑو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے (فانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ، بخاری)

اپنے خلاف تنقید سننے کا شوق

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ اور حضرت معاذ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: میری نگرانی رکھو، میں تم لوگوں کی نگرانی سے بے نیاز نہیں ہوں۔

اپنے خلاف تنقید سن کر بپھرنا خلاف ایمان ہے

عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں خوش حالی بڑھی تو لوگ شادیوں میں بڑی بڑی مہریں باندھنے لگے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی حیثیت سے یہ طے کیا کہ مہر کی مقدار چار سو درہم سے زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ ایک خطبہ میں آپ نے اس کا اعلان فرمایا اور کہا کہ جو شخص چار سو درہم سے زیادہ مہر باندھے گا تو زائد رقم کو ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔ آپ اس اعلان کے بعد ممبر سے اترے تو ایک دراز قد، چپٹی ناک والی بوڑھی عورت کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا: عمر کو مہر کی حد بندی کا کوئی حق نہیں، جب کہ قرآن نے اس معاملہ میں رخصت دی ہے۔ پھر اس نے یہ آیت پڑھی وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدا ھن قنطاراً فلا تاخذوا منہ شیئا (نساء) یعنی اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت بدلنا چاہو اور

تم نے اس کو بہت سا مال دے رکھا ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فوراً کہہ اٹھے :
امرأۃ خاصمت عمر فخصمتہ ، ایک عورت عمر سے جھگڑ پڑی اور غالب ہوگئی (مصنف عبدالرزاق) دوسری روایت میں ہے : اللھم عفوا ، کل الناس افقہ من عمر حتی العجائز (خدایا مجھے معاف فرما۔ تمام لوگ عمر سے زیادہ جانتے ہیں حتیٰ کہ بڑھیاں بھی) اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ دوبارہ منبر پر چڑھے اور اعلان کیا کہ میں اپنا فیصلہ واپس لیتا ہوں۔ جو شخص جتنا چاہے مہر دے۔ اس کو اپنے معاملہ کا اختیار ہے (فتح الباری) البتہ بطور نصیحت فرمایا کہ زیادہ مہر اگر کرامت و شرافت کی علامت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حق دار تھے۔ حالاں کہ آپ نے عام طور پر مہریں چار سو درہم تک رکھی ہیں (مسند احمد، ترمذی)

آپس کی لڑائی اسلام کے خلاف ہے

من حمل علینا السلاح فلیس منا (حدیث) جس نے ہمارے اوپر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں۔

اللہ کے حوالے کر کے صبر کر لینا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے امیر معاویہ کے بعد یزید کی خلافت پر بیعت کی تھی۔ بیعت کے وقت انھوں نے فرمایا : اگر یہ خیر ہے تو ہم اس سے راضی ہیں۔ اور اگر یہ شر ہے تو ہم نے اس پر صبر کیا۔

ٹکراؤ کے باوجود ایک دوسرے کا احترام

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں میں جو باہمی لڑائیاں ہوئیں وہ اگرچہ ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ تاہم یہ اونچے انسانوں کی لڑائیاں تھیں، نہ کہ ذلیل طبیعت کے لوگوں کی۔ عین جنگ کے وقت کے بہت سے قصے تاریخوں میں درج ہیں جو ان کی طبیعت کی بلندی اور بہادری کو بتاتے ہیں۔ مثلاً حضرت علی اور امیر معاویہ کی جنگوں میں یہ حال تھا کہ دونوں فریق دن کے وقت ایک دوسرے سے لڑتے اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جا کر مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیتے (البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۲۲۷۔ تہذیب تاریخ ابن عساکر، جلد ۱، صفحہ ۷۴) اسی طرح حضرت حسین کی لڑائی جو یزید بن معاویہ کی فوجوں سے ہوئی، اس میں یہ حال تھا کہ دونوں فوجیں جو ایک دوسرے کے خلاف برسر جنگ تھیں۔ جب نماز کا وقت آتا تو سب مل کر نماز پڑھتے۔ ایک فوج کا سردار دوسری فوج کے سپاہیوں کی امامت کرتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت حسین رضؓ امام ہوتے اور فریق مخالف ان کے پیچھے صف باندھ کر نماز ادا کرتا

دوستی میں بھی اعتدال، دشمنی میں بھی اعتدال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اپنے دوست سے اعتدال کے ساتھ دوستی کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا دشمن بن جائے۔ اور اپنے دشمن سے اعتدال کے ساتھ دشمنی کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا دوست بن جائے (احبب حبیبک ھونًا ما عسی ان یکون بغیضک یومًا ما وابغض بغیضک ھونًا ما عسی ان یکون حبیبک یومًا ما)

آہ یہ بے شعوری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا۔ اس کے بعد دہلی کا ایک اخباری رپورٹر علی گڑھ پہنچا اور اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا۔ اس انٹرویو میں مذکورہ پروفیسر نے یونیورسٹی کے اندرونی نظام کی بعض خرابیوں کا ذکر کیا جس کے نتیجہ میں وہاں ہنگامہ پسند لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعلیمی معیار مسلسل گر رہا ہے۔ یہ انٹرویو چھپا تو یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ مشتعل ہو گئے اور یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور ادھم بازی شروع کر دی۔ حالاں کہ ان کا پُرتشدد ردعمل صرف یہ ثابت کر رہا تھا کہ پروفیسر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر موجود ہیں۔

مسلم صحافت اور قیادت نے حسب معمول اس معاملہ میں طلبہ کا ساتھ دیا۔ مسلم اخبارات نے اس انٹرویو کو انتہائی قابل اعتراض (۱۶ مئی ۱۹۸۱) قرار دے کر اس کے خلاف پرشور مضامین لکھے۔ مگر اردو یا انگریزی کے کسی بھی اسلام پسند اخبار نے انٹرویو کے اصل الفاظ شائع نہیں کئے۔ جن لوگوں نے اصل انٹرویو کو انڈین اکسپریس میں پڑھا ہے وہ اتفاق کریں گے کہ اس یک طرفہ لفظی طوفان کی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ مسلم اخبارات اصل انٹرویو شائع کر دیتے تو قارئین پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ وہ یقینی طور پر "انتہائی قابل اعتراض" نہیں تھا۔ وہ بس ایسا ہی تھا کہ یا تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا یا اس کے جواب میں ایک وضاحتی مضمون مرتب کر کے شائع کر دیا جاتا ——— یہ ہے ہماری وہ غیر عادلانہ سیاست جس پر ہم یقین کئے بیٹھے ہیں کہ خدائے عادل ہمارے اوپر اپنی نصرتوں کی بارش برسائے گا۔

اس قسم کے لایعنی ہنگاموں کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کے طلبہ کے یہ ہنگامے جو اسلام کے نام پر کئے گئے ان پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے تین قسطوں میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ مسٹر جے۔ ڈی سنگھ نے اپنی اس رپورٹ میں جو باتیں کہی ہیں ان میں سے ایک بات ان کے الفاظ میں یہ ہے۔

> Why do the AMU students raise the cry of 'Islam in danger' at the slightest pretext.? Is Islam which has withstood major onslaughts on it in the past, become so fragile as to be seen to crumble before a mere newspaper article by a marxist.

ایسا کیوں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ انتہائی معمولی باتوں کو لے کر "اسلام خطرہ میں" کی چیخ پکار بلند کرنے لگتے ہیں۔ اسلام جو ماضی میں اپنے اوپر بڑے بڑے حملوں کے مقابلہ میں قائم رہا کیا اب اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک اخبار میں کسی مارکسسٹ کا محض ایک مضمون چھپ جانے سے وہ منہدم ہوتا ہوا نظر آنے لگے (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ مئی ۱۹۸۱) اس سے اندازہ کیجئے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے علم بردار کس طرح اسلام کے نادان دوست ثابت ہوئے ہیں

مسلم یونیورسٹی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے جس میں ان تمام سرگرمیوں کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے جو ہمارے یہاں ملت کے نام پر جاری ہیں۔ نیز اسی مثال سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری ملی سرگرمیاں اپنی ساری دھوم کے باوجود اس قدر ناکام کیوں ہیں۔

۱۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ ایجی ٹیشن پروفیسر عرفان حبیب کے ایک انٹرویو کے نام پر شروع کیا گیا۔ اس ایجی ٹیشن میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مگر آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اس انٹرویو کو انگریزی میں مکمل طور پر پڑھا ہے۔ زیادہ تر لوگ بس سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس کے خلاف مجاہد بنے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن کے اس حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے کہ:

یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (حجرات ۶)

اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو پھر اپنے کیے پر تم کو پچھتانا ہو

۲۔ پروفیسر موصوف نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف ایک اخباری مضمون کی اشاعت تھی۔ مگر اس کے جواب میں جو کچھ کیا گیا وہ مار پیٹ، ہنگامہ اور توڑ پھوڑ تھا۔ یہ بھی قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی کہ:

والذین اذا اصابہم البغی ہم ینتصرون و جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا (شوریٰ ۴۰)

اور وہ لوگ کہ جب ان پر سرکشی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی

۳۔ پروفیسر موصوف کا انٹرویو یونیورسٹی کے نظم ونسق کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایک عام تعلیمی بات تھی مگر اس کو غلط طور پر اسلام اور کفر کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ اپنی دنیوی سیاست کے لئے دین کا نعرہ استعمال کرنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے:

ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا (بقرہ ۴۱)

اور میری آیتوں پر تھوڑی پونجی نہ خریدو

۴۔ پروفیسر موصوف نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی میں انتظام اور تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ خاموش تعمیری جدوجہد کے ذریعہ انتظام اور تعلیم کے معیار کو بلند کر دیا جاتا۔ یہ مذکورہ بیان کی نہایت کامیاب تردید ہوتی۔ اس کے برعکس شور وغل اور ہنگامہ بازی شروع کر دی گئی۔ یہ قرآن کے الفاظ میں ایسے کام کا کریڈٹ لینا تھا جس کو آدمی نے کیا نہیں۔ یہ حضرات اپنے آپ کو یونیورسٹی کے خادم کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے۔ حالانکہ یونیورسٹی کی جو اصل خدمت تھی اس کو انھوں نے انجام ہی نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کو قرآن کے اس انتباہ سے ڈرنا چاہئے:

لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنہم بمفازۃ من العذاب ولہم عذاب الیم (آل عمران ۱۸۸)

جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو تو ان کو تم عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

طبیعیات سے مابعد الطبیعیات کی تصدیق

لندن سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے "قاموس جہالت" اس میں ساٹھ مشہور سائنسداں مختلف علمی شعبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کن چیزوں کے بارے میں ابھی تک لاعلم ہے۔ یہاں ان میں سے دس مختلف سائنس دانوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی شعبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے شعبہ کی واحد سب سے بڑی نامعلوم حقیقت کیا ہے۔

۱۔ کائنات اتنی یکساں کیوں

آئن رکسبرگ، پروفیسر تطبیقی ریاضیات، کوئن میری کالج، لندن: کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزار میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد پر مشتمل ہیں جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

۲۔ کیا کوئی زڈ ذرہ ہے

عبدالسلام، پروفیسر نظری طبیعیات، امپیریل کالج، لندن: اگلے دس برسوں میں ہمیں یا تو زڈ ذرہ کا وجود تسلیم کرنا ہے یا یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کا وجود ثابت ہو گیا جیسا کہ موجودہ نظریہ کی پیشین گوئی ہے تو اس کے بعد عالم فطرت کی چار طاقتیں جن کا ہمیں علم ہے ان میں سے دو طاقتوں کا ایک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (یہ چار طاقتیں یہ ہیں: کشش، برقی مقناطیسیت، طاقت در نیوکلیر فورس جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کو آپس میں باندھے رہتی ہے، اور کمزور نیوکلیر فورس جو ریڈیائی لہروں سے متعلق ہے) پروفیسر عبدالسلام اور دوسرے سائنس دانوں نے حال میں کمزور نیوکلیر فورس اور برقی مقناطیسیت کو ایک ثابت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ زڈ ذرہ کی دریافت سے قوی تجرباتی تائید حاصل ہو گی۔

۳۔ ڈی این اے سے پہلے کیا تھا

ڈاکٹر گراہم کیرنس اسمتھ، لکچرر کیمسٹری، گلاسگو یونیورسٹی: ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک نیا

جینیٹک مادہ دریافت کریں جو ڈی این اے سے بالکل مختلف ہو۔ (ڈی این اے کا دہرا مرغولہ نما ڈھانچہ کیمبرج میں ۱۹۵۳ میں فرانسس کریک اور جیمس واٹسن نے دریافت کیا تھا) مجھے یقین نہیں کہ ڈی این اے ابتدائی زمین پر بن سکتا تھا۔ ضروری ہے کہ زندگی کسی اور چیز سے شروع ہوئی ہو اور ڈی این اے کا ارتقا بعد کو ہوا ہو۔

۴۔ جین کس طرح متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں

سرجان کینڈریو، چیرمین یورو پین مالے کیولر بیالوجی آرگنائزیشن، ہائڈلبرگ: جین کس طرح بیکٹیریا میں متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں، ان کی بابت ہم کسی قدر جانتے ہیں۔ مگر اعلیٰ حیوانات میں یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے، اس کی بابت ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (جین کے متحرک اور غیر متحرک ہونے ہی کی وجہ سے ایسا ہے کہ ایک جسم کے سل، جو سب کے سب ایک قسم کے جین پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ مختلف قسم کے عمل کر پاتے ہیں اور نسوں، جلد وغیرہ کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں)

۵۔ ہمارے اندر محفوظ نظام کیوں

جسم کا مانعی نظام ہم کو چھوت سے بچاتا ہے۔ یہی ہمارے اندر الرجی کا سبب ہے، اور اعضاء کی پیوند کاری کو اس قدر مشکل بنا دیتا ہے۔ مگر اڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر میکلم کے نزدیک "سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ مانعی نظام کیسے کام کرتا ہے، بلکہ یہ کہ خود اس کا وجود ہی کیوں ہے۔ بے ریڑھ کے جانور اس کے بغیر بھی اچھی طرح گزر کر لیتے ہیں۔ مگر ریڑھ دار حیوانات میں یہ نظام ناقابل یقین حد تک پیچیدگی کے ساتھ شامل ہے۔ پچھلے دس سالوں سے اس خیال کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ اس نظام کی ضرورت اس لئے تھی کہ خلیہ کی سطح میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو سرطان کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا پتہ لگایا جا سکے، مگر بہت سی حالیہ دریافتیں اس کی تائید کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔

۶۔ ارتقار کی پیمائش ہم کیسے کریں

جان میزڈاسمتھ، پروفیسر حیاتیات، سیسکس یونیورسٹی کا خیال ہے کہ ارتقار کا نظریہ ایک ناقابل حل اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے۔ نظریہ ارتقار کے تین حقیقی اجزار ہیں:

تغیر (جین میں تبدیلی کا واقع ہونا)

انتخاب (فرق کا باقی رہنا یا مختلف اقسام کی زرخیزی

نقل مکانی

یہ نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، اکثر حالات میں ناقابلِ پیمائش حد تک نچلی سطح پر، ارتقار کے عمل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اس طرح ہم تین طریقوں سے واقف ہیں جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ ارتقار کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس ایک ریاضیاتی نظریہ ہے جو ہم کو بتاتا ہے کہ یہ تینوں طریقے ایسی سطحوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں جن کی بالواسطہ پیمائش کی ہم امید نہیں رکھتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے پاس برقی مقناطیسیت کا ایک نظریہ تو ہو مگر ہمارے پاس نہ تو برقی لہروں کو ناپنے کا کوئی ذریعہ ہو اور نہ مقناطیسی زور کو ناپنے کا۔

۷۔ نظام عصبی کس طرح بنتا ہے

فرانسس کریک، سالک انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا: حیاتیاتی ترقیات میں شاید سب سے بڑا علمی چیلنج یہ سوال ہے کہ ایک جاندار میں عصبی نظام کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بہت سال پہلے راجر اسپری نے تجربہ کرکے دکھایا تھا کہ اگر ایک دریائی چھپکلی کی آنکھ اس طرح نکالی جائے کہ اس کی نظر کی نس آنکھ سے دماغ تک ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھ کو دوبارہ الٹ کر بھی لگا دیا جائے تو نظر کی نس آنکھ کے پردے سے دوبارہ شروع ہوکر دماغ کی طرف بڑھے گی اور دوبارہ اس سے جڑ جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد جانور اس آنکھ سے دوبارہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر ہمیشہ الٹی شکل میں (کیونکہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی) دوسرے لفظوں میں یہ کہ نیا تعلق بالکل درست تھا۔ بجز اس کے کہ آنکھ کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ نتائج بتا رہے ہیں کہ اعصاب کے ایک نظام کو اعصاب کے دوسرے نظام سے ٹھیک ٹھیک مربوط کرنے کے لئے بہت ہی درست اور پیچیدہ طریقے کار فرما ہوتے ہیں۔ مگر یہ طریق عمل کیا ہے، اس کو ہم متعین طور پر نہیں جانتے۔ (دوسرے لفظوں میں خود یہ واقعہ کہ آنکھ الٹی لگی تھی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رابطے کس قدر متعین ہوتے ہیں)

۸۔ کوانٹم نظریہ کیا کشش کے نظریہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے

سر ہرمن بوندی، چیف سائنٹسٹ، شعبۂ انرجی: اگر ہم آئن سٹائن کے مقبول عام نظریہ کشش کو مانیں تو کسی مقناطیسی میدان کے مرکز میں یکایک تبدیلی (مثلاً دو ستاروں میں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہوں) سے ایسا ہونا چاہئے کہ کشش کی لہریں روشنی کی سی رفتار سے پیدا ہوں۔ ریڈی ایشن کی دوسری تمام صورتیں "کوانٹم" کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلسل نہیں ہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مقداروں کی شکل میں غیر مسلسل طور پر آتی ہیں۔ یہ بات بمشکل قابل فہم ہے کہ کشش کی لہریں مقداروں کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ مگر ابھی تک کوئی اس بات کو ثابت نہیں کر سکا ہے، حالاں کہ بہت سے لوگ اس کی کوشش کر چکے ہیں۔

۹۔ دماغ کے مختلف حصے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں

پروفیسر ہوریس بارلو، کیمبرج: ہم تقریباً مکمل طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ دماغ کے مختلف حصے کیونکر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس وقت دماغ کے سننے والے حصہ میں اور بقیہ حصوں میں کس قسم کا ارتباط قائم ہوتا ہے جب کہ ہم کسی مانوس آواز کو پہچانتے ہیں۔ تم بول کو مثال میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ مگر وہ ایک بچہ کی توتلاہٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ہوتی ہے جو خود بھی صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ دماغ کے اندر عصبی حرکات صوتی لہروں کے مساوی ہوتی ہیں۔ مگر ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح بامعنی ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ انسان کب سے زمین پر ہے

ڈاکٹر ڈونالڈ جانسن، میوزیم آف نیچرل ہسٹری، کلیولینڈ، اوہائو: یورپ افریقہ اور ایشیا میں جو متحجرات (فاسل) برآمد ہوئے ہیں، وہ انسان کی ابتدا کو اور زیادہ پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بہرحال یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ ارتقار کا معاملہ (سابقہ تصور کے خلاف) کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، وہ مدت جس کا تعین ایک مسئلہ ہے، وہ تین ملین سے لے کر دس ملین سال پیچھے تک ہے۔ انسان کے امکانی آبا و اجداد میں بظاہر بہت زیادہ فرق رہا ہے۔ اور ہم کو نہیں معلوم کہ ان کے درمیان باہمی رشتہ کیا تھا (اس کی وجہ جزئی طور پر ڈاکٹر جانسن کی حبش میں دریافتیں ہیں۔ نیز اس سے بھی زیادہ قدیم متحجرات پاکستان میں ملے ہیں)

تبصرہ

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی توجیہہ خالق کو مانے بغیر نہیں ہو سکتی۔ سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات میں عددی تناسب ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق میں ایک ریاضیاتی ذہن کام کر رہا ہے۔ انسان کی بناوٹ میں اتنی حکمتیں کارفرما ہیں کہ کوئی بھی طبیعیاتی توجیہہ اس کی تشریح کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ ایک جان دار کی آنکھ نکال کر اس کو دوبارہ الٹ کر لگا دیا جائے تو وہ جان دار اب بھی دیکھے گا مگر اس کو ہر چیز الٹی دکھائی دے گی۔ جسم کے مختلف اجزار جو انتہائی صحت کے ساتھ کام کرتے ہیں وہ ایک بے حد نازک ترکیب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آواز سائنسی اعتبار سے کچھ لہروں کا نام ہے مگر یہ لہریں انسان کے دماغ میں داخل ہو کر بامعنی کلام کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس قسم کے بے شمار عجائب ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دنیا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ ذہن ہے جو زبردست طاقت کے ساتھ اس کو کنٹرول کر رہا ہے۔ کائنات کے نظم اور معنویت کی اس کے سوا کوئی اور توجیہہ نہیں کی جا سکتی ——— دنیا کے بارے میں انسان کی لاعلمی ایک بہت بڑے علم کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ علم کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جو اس کو حد درجہ حکمت کے ساتھ چلا رہا ہے۔

ارجنٹ سروس
صرف ۹۰ منٹ

م مختصر وقت ... ... صِرف ۹۰ منٹ

ا اِسٹیم پریس ... ... بہترین فینشنگ

ڈ ڈرائی کلیننگ ... ... جدید مشینوں کے سَاتھ

ل لاجواب چمک دمک ... ... ہی

آپ کی شخصیت کو پُر وِقار بَناتی ہے۔

ماڈل ڈرائی کلینرز اینڈ لانڈررز

۱۴۴۳-بازارِ چتلی قبر، دہلی

فون: ۲۷۰۸۰۱ – ۲۶۳۱۰۷

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول لے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ فاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

روزہ داروں کے لیے بھی
طاقت کا ذریعہ

سنکارا

روزوں میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھیے!
سنکارا روزہ داروں کے لیے قوت و توانائی کا خاص وسیلہ ہے۔
سحری و افطار کے وقت اس کی ایک ایک خوراک لینے سے
تھکاوٹ اور کمزوری دور ہو کر چستی و طاقت بحال ہو جاتی ہے۔

سنکارا

وٹامنوں اور قدرتی اجزا سے بھرپور
ہر موسم میں گھر بھر کے لیے مثالی ٹانک

ہمدرد

HTD-HWL-6905

We are exporters of fresh HALAL meat and other marine products of high quality

AL-MASHRIQ International

MANUFACTURERS, IMPORTERS, EXPORTERS
Specialists in Food Products

7261 & 6403, QURESH NAGAR
SADAR BAZAR, DELHI-110006 (INDIA)
Phones Off : 511924 527739, 511600, 518440,
Cable :- Qasbah Res. : 637676, 503732

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

AUGUST 1981
ISSUE NO. 57

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۱۵-۰
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰
۳- ظہورِ اسلام	۱۵-۰
۴- دین کیا ہے؟	۲-۰
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۵-۰
۶- تجدیدِ دین	۳-۰
۷- اسلام دینِ فطرت	۳-۰
۸- تعمیرِ ملت	۳-۰
۹- تاریخ کا سبق	۳-۰
۱۰- مذہب اور سائنس	۵-۰
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۳-۰
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۲-۰
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰
۱۴- تعارفِ اسلام	۲-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰
۱۶- راہیں بند نہیں	۳-۰
۱۷- دینی تعلیم	۳-۰
۱۸- ایمانی طاقت	۳-۰
۱۹- اتحادِ ملت	۳-۰
۲۰- سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۳-۰
۲۴- زلزلۂ قیامت	۴-۰
۲۵- سچا راستہ	۱-۰

مکتبہ الرسالہ - دہلی-۶